سیرۃ النبی ﷺ

جلد ہفتم

علامہ سید سلیمان ندوی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کتابِ مستطاب

سِیرۃُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سوانحِ اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جلد ہفتم

مشتمل بر معاملات

سیرت کے

چند متفرق مضامین ومباحث کا مجموعہ

تالیف

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی سنہ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء

دار المصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ یو۔پی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

سلسلۂ دارالمصنفین نمبر: ۱۳۷

کتاب	:	سیرۃ النبی ﷺ حصہ ہفتم
مصنف	:	مولانا سید سلیمان ندویؒ
صفحات	:	۱۵۰
جدید ایڈیشن	:	۲۰۱۹ء
مطبع	:	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)
ناشر	:	دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)
قیمت	:	
باہتمام	:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

ISBN: 978-93-80104-73-7

Darul Musannefin Shibli Academy

P.o. Box No - 19, Azamgarh

e -mail: shibli_academy@rediffmail.com

Website : www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حصہ ہفتم

مضمون	صفحہ
فہرست	۱ تا ۴
پیشِ لفظ از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۱ تا ۶
اظہارِ عجز از سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ	۷
مقدمہ - معاملات ۸ - ۱۷	
ساتویں جلد کا موضوع، معاملات	۸
معاملات کے حدود	۸
معاملات سے ہماری مراد	۹
اس کام کا اشکال	۱۰
دیگر مذاہب اور معاملات	۱۱
معاملات کے ماخذ	۱۱
قانون سازوں کی بے چارگی	۱۲
جمہوریت کی ناکامی	۱۲
صحیح وعادلانہ قانون سے انسانیت کی ناچاری	۱۲
قانونِ الٰہی کی ضرورت	۱۲
کتاب اور میزان	۱۳
قانونِ الٰہی کی دائمی یکسانیت	۱۵
فطری حقوق ومعاملات کی یکسانی	۱۵
قانون کا بنیادی تخیل	۱۶
قانونِ الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت	۱۶
ایک اصولی فرق	۱۷
اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت ۱۸ - ۴۲	
عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت ۴۳ - ۸۱	
سلطنت اور دین کا تعلق ۸۲ - ۱۰۴	
لفظ رعیت	۸۹
سلطنت وملکیت کی حقیقت	۹۴
اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کردیے	۹۴
لفظ ملک الملوک کی ممانعت	۹۵

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
امتِ مسلمہ کی بعثت ۱۰۵ - ۱۱۷		اشاریہ از کلیم صفات اصلاحی ۱۳۷ - ۱۴۷	
قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ ۱۱۸ - ۱۲۲			
اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے ۱۲۳ - ۱۳۵		اشخاص کتب مقامات	۱۳۹ ۱۴۳ ۱۴۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والصّلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وخاتَم النّبیّین

محمد والہٖ وصحبہ اجمعین

پیش لفظ

سیرۃ النبی ﷺ اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاعِ گراں مایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح وتوصیف کی اب ضرورت نہیں، بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر وعقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی ودیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مرادف ہے:

مادحِ خورشید مداح خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ وسلام کی سیرت طیبہ، حالات وواقعات اور شمائل وعادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی ﷺ، تعلیمات نبوی ﷺ اور شریعتِ اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے، انھوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے۔ دلائل ومعجزات اور منصبِ نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی

تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثتِ محمدی ﷺ اور سیرت نبوی ﷺ کی وسعت و جامعیت اس کی بے خطا رہبری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیاتِ انسانی و نسلِ آدم کے لئے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لئے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحبؒ کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیماتِ نبویؐ پر ایک ''دائرۃ المعارف'' (انسائیکلو پیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی، لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتابِ زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انھوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلۂ سیرۃ النبی ﷺ کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات، وسعتِ نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و تورع، شریعتِ اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستند ترین مآخذ سے نہ صرف براہِ راست واقفیت بلکہ اُن میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعتِ اسلامی اور تعلیماتِ نبویؐ کی بہتر سے بہتر نمایندگی اور ترجمانی ہوتی، افراط و تفریط سے پاک، تجدد و آزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں اُن صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنۂ جواب رہتے ہیں، اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گذشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیاتِ مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی، قلم میں خطباتِ مدراس اور سیرۃ النبی ﷺ کی جلد سوم، چہارم و پنجم و ششم کا زور اور

آبشارِ علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بنا پر دار المصنفین کی وہ پُرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہمہ وقت موقع اور فراغِ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل وغیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا، لیکن ایک مبصر و ماہر فن اور ایک استاد وکہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سیکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصلِ مطالعہ ہوتا ہے، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرۃ النبی ﷺ کے مے خانے کے مے خوار اور سید صاحب کی تحریرات وتحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لئے جو متفرق مضامین ومباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیورِ طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبی ﷺ کی چھ جلدوں کے قارئین وعشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب ونظر کو روشن کرتے، خدا کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دار المصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی موقع ملا اور انھوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبی ﷺ جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے، لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر ونظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گے، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط وتفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انھوں نے مغربی ومادی فلسفوں کا اثر شعوری وغیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے، اس لئے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا، اس لئے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

”اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاقِ حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو

سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات واقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علماء کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے''۔(۱)

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

''اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز ۷؍جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ؍ہجری کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹؍رمضان ۱۳۶۰ھ؍ہجری کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا، اور پھر رُک جانا پڑا، ۲۴؍شعبان ۱۳۶۲ھ؍ہجری کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رُک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ؍ہجری کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔(۲)

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آگئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آسکتی ہیں، مثلاً اس کتاب میں ''معاملات'' کی تعریف، اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے، ''میزان'' کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے، سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی وانقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدت مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکزِ ارشاد سے تعلق تھا، وہ نہ صرف سیاست وحکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح وتربیت کے لئے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا، ایسی صورت میں اُن کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری ممیزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت وسلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب ونبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے''۔(۳)

(۱) سیرۃ النبی ﷺ جلد ۷: مقدمہ ص ۱۰-۱۱۔ (۲) ایضاً ص ۱۱۔ (۳) مقدمہ ص ۲۱۔

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بینات جمع کر دیئے ہیں اور یہ سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے، لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتی ہے اور ان کے قلم سے حسبِ ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

''اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان، شرائع واحکام اور حقوق وفرائض اس کے لئے بہ منزلۂ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق وفرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہِ اطمینان اور سکونِ خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل بہ آسانی کر سکے، اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے''۔(۱)

اور اس کی تائید کے لئے وہ سورۂ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے اُن مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری واستواری اور اس امن وامان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چوں کہ مذاہبِ سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریقِ دین وسیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبال نے صحیح کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزیری

اس لئے خطباتِ مدراس اور رسولِ وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ:

''اسلام دین ودنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے

(۱) مقدمہ ص ۳۳۔

فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمراں ہے، وہی زمین پر فرماں روا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ — اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔(۱)

(زخرف: ۴۳-۸۴)

چوں کہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انھوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافتِ اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہوگئی ہے، نیز وہ موجودہ دور کے قیامِ حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لئے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

"اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول ہے، نہ خراج کا وصول ہے، نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لئے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے"۔(۲)

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاسیات اور نظمِ حکومت کا پورا حصہ آجاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پُر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں "نقش سلیمانی" ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثارِ قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگار نبویؐ، متکلم اسلام اور نابغۂ عصر استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی کسی جلد پر ہیچ مداں پیش لفظ لکھے لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے، اس لئے اس پر ایک "ناقص" کا کچھ لکھنا محلِ تعجب نہیں کہ:

ع — دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ابوالحسن علی ندوی

۱۱ر رجب ۱۴۰۰ھ ہجری
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲۸ر مئی ۱۹۸۰ء

---

(۱) مقدمہ ص ۳۴۔ (۲) ایضاً ص ۴۲۔

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی
کہ محرم نیست خسرو راز باں در گفت و گوئے تو

دار المصنفین، اعظم گڑھ
۲۳ر شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ ہجری
۷ر جولائی ۱۹۸۰ء

ہیچ مداں مور سلیمان
سید صباح الدین عبد الرحمٰن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدالمرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ الطاہرین

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات: سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود: معاملات کا اطلاق فقہاء نے حقوقِ عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے، مثلاً بعض فقہائے شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امورِ دنیا سے ان کا تعلق ہوگا، تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین کے متعلق ہیں، اشخاص کی بقا مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید وفروخت واجارہ ورہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقا مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح وطلاق وخلع وتفریق وغیرہ) اور اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقا ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے(۱) (جیسے قصاص وسزا وتعزیرات وغیرہ)۔

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی، جن پر دین ودنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین ودنیا میں فساد راہ پائے گا اور انسانی زندگی خطرے

(۱) کشاف اصطلاحات الفنون، احمد تھانوی مطبوعہ کلکتہ ج ۱ ص ۲۳ بحوالہ توضیح وتلویح۔

میں پڑ جائے گی، یہ قسمیں کی ہیں، عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ اور عادات جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام اور تیسری چیز معاملات ہے، جس سے مقصود نسل ونفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز جنایات ہے، جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجرا اُس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے (جیسے قصاص وحدود وتعزیرات)۔

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن عابدین نے بحرالرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر منقسم ہے، معاوضات مالیہ (بیع وفروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح وطلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر، یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے، اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتل نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبروریزی پر زجر، کسی کی پردہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

معاملات سے ہماری مراد: لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکامِ شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوقِ عباد سے جن کی حیثیت قانون کی ہے، جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان ومال وآبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی ومملکت (مدینہ) کی۔

آبادی ومملکت جن کا قانونی نام مدنیہ ہے، اس کی حفاظت ومصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے، لیکن ہمارے قدیم فقہاء نے اس کے لئے سِیَر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد، اس میں امارت وخلافت اور صلح وجنگ کے مسائل آجاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکامِ سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے الاحکام السلطانیہ، قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۴۵۰ھ ہجری اور الاحکام السلطانیہ، قاضی ابویعلی حنبلی المتوفی ۴۵۸ھ ہجری لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ وخراج وزکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، اور اسی لئے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال، ابوعبید بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ ہجری اور کتاب الخراج، قاضی ابویوسف المتوفی ۱۸۲ھ ہجری اور کتابِ الخراج، یحیٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ ہجری، اہل سنت کے نزدیک گو

امامت اصولِ عقائد میں سے نہیں ہے، تاہم اس کے ضروری مباحثِ کتبِ عقائد کے خاتمہ میں ذکر کردیئے جاتے ہیں، جن میں امامت کے شرائط اور طریقِ انتخاب، اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرزِ بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے لئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی، اسی لئے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی اور مباحث میں ردوبدل اور نئی ضرورتوں کے لئے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت، مال ودولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق اُن تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زائد افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان کے ضابطوں اور قانونوں کی تفصیل ہو، ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے سے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہوسکتی ہیں، معاشریات، اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہوسکتے ہیں اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے۔ معاشریات میں نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی وتجارتی کاروبار کا بیان آجائے گا اور سیاسیات میں حکومت وسلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال: یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقہاء نے فقہ کی متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس لئے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کردینا ہوتا تو کام آسان تھا، مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاقِ حال تسکین پاسکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات واقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور

ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدماء کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے، مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ کے سیاسیات کے احکام و فرائض کا ماخذ خود ذاتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور ﷺ کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے، جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علاحدہ کرنا ہے، یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گو ۷؍ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ ہجری کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیے، دو سال کے بعد ۲۹؍ رمضان ۱۳۶۰ھ ہجری کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴؍ شعبان ۱۳۶۲ھ ہجری کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ ہجری کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ○ وَیَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ○ (طٰہٰ:۲۰-۲۵تا۲۸)

دیگر مذاہب اور معاملات: دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کیے ہیں، تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزء ہے، لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے، ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں، مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے، تاہم یہ سب قومیں اپنے قانون کا ماخذ علمِ الٰہی اور علمِ مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ: دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنہوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحیِ الٰہی کے بجائے عقل انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ و قیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلانِ طبع قانون کا معیار ہے، کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے، یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا و ہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا و ہوس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانین جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بے چارگی: اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی، قوم اور غیر قوم، امیر اور غریب، سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمین دار، طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معرض بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لئے آیۂ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی: اس جوش وخروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیۂ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کم زوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بہ یک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے، پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے، اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہوجاتی ہے اور تیسری اور چوتھی، اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے، ان تمام تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے، ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہونچتا، یا ایک کو پہونچتا ہے دوسرے کو نہیں تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گذر جاتی ہے اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح وعادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری: ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے، چوں کہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا، اس لئے قدم قدم پر اس کے چلانے والے کے ذاتی مفاد سے وہ ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص وطمع، غرور وتکبر، ہوا وہوس، رشوت اور انتفاع ناجائز، خوف وہراس اور مکر وحیلہ کے بیسیوں خلاف انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہوجاتا ہے اور عدل وانصاف کی میزان ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔

قانونِ الٰہی کی ضرورت: اسی سبب سے مصلحت الٰہی کا تقاضہ یہ تھا کہ عدل وانصاف کی یہ میزان خود دستِ الٰہی میں ہو، وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں، کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لئے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک وبے نیاز ہے، جس کو اپنے لئے اور اپنی غرض کے لئے کچھ نہیں چاہئے، جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات

کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں، جاری کر رکھا ہے، اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں، جاری فرمائے، جو تمام تر عدل وانصاف پر مبنی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ (شوریٰ:۴۲-۱۷)	وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ (حدید:۵۷-۲۵)	اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔

کتاب اور میزان: میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں بلکہ فطرت اور عدل وانصاف اور حق کی میزان ہے، جس سے سارا نظامِ کائنات تُل رہا ہے اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں، چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے:

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ○ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ○ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ○ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ○ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ○ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ○ (رحمٰن:۵۵-۱تا۹)	رحمت والا (خدا) جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں، اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیرِ فرمان ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی تاکہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے، اس لئے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو، ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ دیکھو یہ قصد وارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد وارادہ کے بغیر کس طرح عدل وانصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام واصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد وارادہ کی دولت ونعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہئے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد وارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکامِ عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ (انعام:۶-۱۵۲)	اور ناپ اور تول کو پورا کرتے رہو۔
فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ (اعراف:۷-۸۵)	تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔
اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ (ہود:۱۱-۸۵)	ناپ اور تول کو پورا کرو۔
وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ (ہود:۱۱-۸۴)	ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید وفروخت کی اشیاء بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں (۱) ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لئے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لئے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لئے دوسری ترازو سے، اس ستم پیشہ پر خدا کی اور ساری دنیا کی پھٹکار:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى	پھٹکار ہے ان کم کردینے والوں پر جو اپنے لئے لوگوں سے
النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ	ناپ پوری لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے
يُخْسِرُوْنَ ○ (مطففین:۸۳-۱تا۳)	ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔

معاملاتِ انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی ایک نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورۂ حدید میں زمین میں قیامِ عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ	اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور
وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا	ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو،
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ	تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا جس
لِلنَّاسِ (حدید:۵۷-۲۵)	میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے کئی فائدے ہیں۔

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب یعنی احکام الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار کے دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکامِ الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں، ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا

(۱) تفسیر طبری میں آیات میزان سورہ حدید ج ۲۷ ص ۱۲۲ اور سورہ رحمٰن ج ۲۷ ص ۶۲، ۶۳ مطبع میمنیہ مصر وغیرہ میں دیکھئے۔

ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت وریاست ہے اور اسی کے دوسرے ہاتھ میں قانونِ الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہئے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الٰہی کی دائمی یکسانی: قانونِ الٰہی کے نظریہ پر ایک شبہہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے، اس لئے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہئے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیوں کہ شے نہیں بدلتی، اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں، جس طرح مادیات کے اصولِ طبعی کبھی نہیں بدلتے (الّا ماشاء اللہ) گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے، اور ٹھنڈی ٹھنڈی، آگ برف نہیں بنتی، برف آگ نہیں، روشنی تاریکی نہیں، تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے، رات اور دن پے درپے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھڑی، پلک اور لمحے دم بہ دم بدل رہے ہیں، سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں، ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں، جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب وگل کی دنیا پر حکمراں تھا، آج بھی وہی ہے، اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کرسکی، نہ چودھویں صدی، پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں، کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔

ع یعنی خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فتح: ۴۸-۲۳) خدا کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا۔

فطری حقوق ومعاملات کی یکسانی: ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی ومعاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں اُن میں نہ کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا، نیکی بدی نہیں بنتی، بدی نیکی نہیں، سچ جھوٹ نہیں ہوجاتا، جھوٹ سچ نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، دوسروں کی چیز ناحق لینا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، دوسروں کی عزت اور آبرو کو داغ لگانا، دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا، حقِ قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا، کسی کی جائداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا، ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا، لین دین میں طرفین کی رضامندی، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام، اخلاق سوز حرکات کی بندش، فتنہ وفساد کا انسداد، ظالمانہ طریقوں کی ممانعت ہر عہد میں، ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے، جب کبھی کوئی قانون بنا ہے، یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزا رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا

اس کے یہ اجزا برقرار رہیں گے، البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لئے قانونِ الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل: ہر مجموعۂ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جز کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت، کہیں وطنی افادیت، کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے، اس لئے اُس مجموعۂ قانون میں اسی بنیادی نقطۂ غرض کی لکیریں اُبھری نظر آتی ہیں، جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے، وہاں کالے گورے، یورپین اور نیٹو کے اصول پر کارفرمائی ہے، جہاں وطن قانون کی اساس ہے، وہاں جغرافی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری، ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دئے ہیں، یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا بیج بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بے گانہ ہے، بہاری یوپی میں جگہ نہیں پاسکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے، فیشزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت: اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور اطاعت کے لئے زمین سے فتنہ وفساد کا دفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل وانصاف اور امن واطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع وفریب کی روک تھام ہے۔(۱) چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود وتعزیرات ہیں اُن کا مقصد زمین سے فتنہ وفساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات ومعاشرت کے اصول اور مسائل ہیں، ان کا مبنیٰ بندوں کے درمیان عدل وانصاف اور امن واطمینان کا قیام ہے اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں، ان سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع وفریب کا استیصال ہے۔

اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف، زبان اور لغت اور تہذیب وتمدن کا کوئی فرق اور ملک واقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے، یہ قانون خدا کا ہے، خدا کے

---

(۱) علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ ہجری کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں۔

سارے بندوں کے لئے بنایا گیا ہے، وہ چاہے کالے ہوں یا گورے، آریائی ہوں یا سامی، یورپی ہوں یا ایشیائی، ہندی ہوں یا حجازی، عجمی ہوں یا تاتاری سب کے لئے یکساں اور سب کے لئے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق: بے شبہہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس کے اس قانون کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں، اس بناپر انسانی افراد کی چار قسمیں ہوجاتی ہیں، ایک وہ جو اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ خدائے واحد و برحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں، مسلمان ہیں، دوسرے وہ جو گو اس خاص قانون الٰہی کو نہیں مانتے، لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الٰہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو، مانتے ہیں، ان کا نام ذمی ہے، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کے پاس ان کا مانا ہوا قانون الٰہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفۂ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے، یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانونِ الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں، یہ شبہ کتابی ہیں، چوتھے وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفۂ الٰہی سے ناآشنا اور ہر قانون الٰہی سے محروم ہیں، ان کو مشرک کہتے ہیں، اسلامی قانون الٰہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہہ بعض امتیازات ہیں، جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ معاملات کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں، تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوش گوار تعلقات کے برقرار اور امورِ معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لئے ایک عاملانہ طاقت وقوت کا وجود ضروری ہے، جو ہر چیز کو احکامِ شرع اور نظامِ عدل کے مطابق قائم رکھے، اس بحث کے دو ضروری جز ہیں:

۱-اس عاملانہ طاقت وقوت کی ضرورت، حقیقت، اس کے شرائط واوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

۲-معاملاتِ انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علاحدہ علاحدہ احکام اور اس کے اسرار ومصالح۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت

محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ ﷺ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوش خبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی، تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف وخطر کی جاسکے اور اس کے لئے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو:

وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَایُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا○ (نور:۲۴-۵۵)

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لئے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جمادے گا اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا، میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لئے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے تاکہ سارا حکم اسی ایک خدا کا ہو جائے:

وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَاتَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (انفال:۸-۳۹)

اور ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ رہے، اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَافِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ○ (بقرہ:۲-۲۰۱)

اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم وعبادت، تندرستی، روزی، مال ودولت، فتح ونصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی

تجدید ہے، دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا:

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ ○ (نحل:۱۶-۳۰)	اور جنھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے!۔

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر ہے اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی، ان کو بشارت ہے:

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○ (آل عمران:۳-۱۴۸)	تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، نام وری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے۔

جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں:

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (نحل:۱۶-۴۱)	اور جنھوں نے گھر چھوڑا خدا کے لئے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا کی نعمتوں کی دعا مانگی:

وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ (اعراف:۷-۱۵۶)	(اور اے خدا) ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائے دار ہے، اس لئے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○ (ہود:۱۱-۱۵ و۱۶)

جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرایش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں اور کمی نہیں کی جاتی، یہ وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ○ (شوریٰ:۴۲-۲۰)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ○ (آل عمران:۳-۱۴۵)

جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا، اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور شکر گذاروں کو ہم پورا انعام دیں گے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا○ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا○ (بنی اسرائیل:۱۷-۱۸ و۱۹)

جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں، پھر ہم نے اس کے لئے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر، ڈھکیلا جا کر، اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کی اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (نساء:۴-۱۳۴)

تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالاں کہ خدا کے پاس تو دونوں جہانوں کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلب گار ہے، اس کے لئے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لئے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے:

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا○ (نساء:۴-۵۴)

تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی، اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (مائدہ:۵-۲۰)

اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی:

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (بقرہ:۲-۲۴۷)

بے شبہ خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا:

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (بقرہ:۲-۲۴۷)

اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔

حضرت داوٗد علیہ السلام کو خطاب ہوا:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ (ص:۳۸-۲۶)

اے داوٗد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

حضرت سلیمانؑ نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ (ص:۳۸-۳۵)

اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے:

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آل عمران:۳-۲۶)

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنا دیا ہے:

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ○ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ○ (الانبیاء:۲۱-۱۰۵و۱۰۶)

بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں، اس اعلان میں خدا کے فرماں بردار لوگوں کے لئے پیام ہے۔

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتادیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے، فرمایا:

وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○ (حج:۲۲-۴۰و۴۱)

اور البتہ خدا اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے، وہ کہ ہم اگر ان کو زمین میں جمادیں تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں اور بُرے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہوگا اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجرا کی طاقت ہونی چاہئے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود وتعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا:

وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (نور:۲۴-۲)

اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لئے تیار ہونا چاہئے:

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (بقرہ:۲-۲۷۹)

تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے خبردار ہو جاؤ۔

اس لئے نجران کے عیسائیوں سے آپ ﷺ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا (۱) جو لوگ اسلام کے ملک میں

(۱) ابوداؤد کتاب الخراج والفی والامارۃ باب اخذ الجزیہ ج۲ص۳۰ مطبع کستلیۃ مصر ۱۲۸۰ ہجری۔

بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں لوٹ مار کریں قرآن اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطعِ ید اور قید یا جلا وطنی ہے اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے:

ذٰلِکَ لَهُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَلَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ○ (مائدہ:۵-۳۳)	یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کئے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلّی دی:

اِسۡتَعِیۡنُوۡا بِاللّٰهِ وَاصۡبِرُوۡا اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ یُوۡرِثُهَا مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ○ (اعراف:۷-۱۲۸)	خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو، زمین تو خدا کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:

عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّهۡلِکَ عَدُوَّکُمۡ وَیَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ○ (اعراف:۷-۱۲۹)	قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کردے، اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔

آخر جب وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام و بے کس قوم خلافتِ الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی:

وَاَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا یُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا وَتَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ الۡحُسۡنٰی عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ بِمَا صَبَرُوۡا (اعراف:۷-۱۳۷)	اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت دی ہے، اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی، لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے، تو دفعتاً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی:

وَقَضَيۡنَاۤ اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ فِى الۡكِتٰبِ لَـتُفۡسِدُنَّ فِى الۡاَرۡضِ مَرَّتَيۡنِ وَلَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا كَبِيۡرًا ○ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰٮهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِؕ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ○ ثُمَّ رَدَدۡنَا لَـكُمُ الۡكَرَّةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَجَعَلۡنٰكُمۡ اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا ○ اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسٗٓــئُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا ○

(بنی اسرائیل: ۱۷-۴تا۷)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا، تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے، پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا، اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی، اور تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لئے اور برا کرو گے تو اپنا، پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا، تا کہ تمہارے منہ بگاڑ دیں، اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کئے گئے ہیں، وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لئے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی خدا کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی خدا کا وہی برتاؤ ہوگا۔

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت وسلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکامِ الٰہی کی پیروی کی جائے گی، جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی، چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے اور دو دفعہ ان کی شامتِ اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل ومحکوم ہونا پڑا، ایک بابل کے بادشاہ بنوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا، ظالم بادشاہوں کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا:

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ○ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا ○ (بنی اسرائیل:۱۷-۸و۹)	امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا، اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کروگے تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے، اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی ﷺ پر ایمان لائیں، لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہوگئی، کیوں کہ انھیں سنا دیا گیا:

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ (بقرہ:۲-۴۰)	تم میرا وعدہ پورا کرو، تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْکُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا، اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا، اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا، تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے، اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت وخون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے نہ نکالنا، تو تم نے اقرار کرلیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو، پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کردیتے ہو، اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کرکے انھیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو، اگر وہ تمہارے پاس قید ہوکر آئیں تو بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو،

اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج (بقرہ:۲-۸۳تا۸۵)

حالاں کہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) ہے کہ تم کتاب (خدا) کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لئے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیا اور فرمایا:

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (بقرہ:۲-۸۵)

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیے جائیں۔

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنادی گئی:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ○ (بقرہ:۲-۱۱۴)

اور اس سے بڑھ کو کون ظالم ہے جو خدا کی مسجدوں میں خدا کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں، مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہوں اور خدا کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں، ان کے لئے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے، ان کو سولیوں پر لٹکایا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں، ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے:

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ○ (مائدہ:۵-۳۳)

یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنہوں نے کتابِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنالیا تھا، یہ سزا سنادی گئی:

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ○ (مائدہ:۵-۴۱)

دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب ودلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنیاد پر دین میں کج بحثی کرتے ہیں اور دنیاوی جاہ ودولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں، ان کے لئے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ (حج:۲۲-۸و۹)

اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا (کی شان میں بغیر علم ودانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑلیتا ہے تاکہ (لوگوں کو) خدا کے راستے سے گمراہ کردے، اس کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتش سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ کو وحیِ الٰہی نے خبردار کردیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝ (اعراف:۷-۱۵۲)

(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا، ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افتراپردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لئے ذلت، قومی مسکنت اور غضبِ الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے، کیوں کہ انھوں نے احکامِ الٰہی سے انحراف کیا، خدا کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدود الٰہی کو توڑتے رہے:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ (بقرہ:۲-۶۱)

اور (آخرکار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (وبے نوائی) ان سے چمٹادی گئی اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوگئے، یہ اس لئے کہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اس کے) نبیوں کو ناحق قتل کردیتے تھے، (یعنی) یہ اس لئے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

آخرالانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لئے مہلت کا آخری موقع تھا، لیکن ان کی سرکشی بہ دستور قائم رہی، اس پر خدا نے قیامت تک کے لئے ذلت ومسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی

قسمت میں لکھ دی:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْآ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○

(آل عمران:۳-۱۱۲)

یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے، بہ جز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آجائیں، اور یہ لوگ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے، یہ اس لئے کہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے، یہ اس لئے کہ یہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

دوسری سورہ میں ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(اعراف:۷-۱۶۷)

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو اُن کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں، بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے، تاریخ کا کون سا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کئے کی سزا نہیں پائی ہے، اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب، ذلت، نکبت اور مسکنت کی تفسیر ''جزیہ'' سے یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے، قرآن پاک کی دعا میں ہے:

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران:۳-۲۶)

اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔

ان آیتوں میں لف ونشر مرتب ہے، یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں، بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے، احکامِ الٰہی سے انحراف، انبیاء علیہم السلام و مصلحین امت کا قتل و تکذیب، حرص و طمع، سود خواری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور خدا کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ○	(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا، ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (اعراف:۷-۱۵۲)

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچہ کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر اس مفتری کے لئے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہہ سائی کرے گا اور ارض و سما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں در بدر پھرے گا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا:

وَمَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ	اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) خدا رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔ (حج:۲۲-۱۸)

عزیزے کہ از در گہش سر بتافت
بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شروع میں ایمان، اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عملِ صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینھ برستا اور فتوحات کا چشمہ اُبلتا ہے، خدا نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ:۵-۶۵و۶۶)

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں، ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (اعراف:۷-۹۶)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے، مگر انہوں نے تو تکذیب کی، سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بہ طور وعدہ کے فرمایا گیا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور:۲۴-۵۵)

جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ (فتح:۴۸-۲۰)

خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، سو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی۔

مجاہدینِ امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لئے ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے، (وہ یہ کہ) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد

بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌلَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الصف:۶۱-۱۰تا۱۳)

کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغ ہائے جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں، داخل کرے گا، یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو (یعنی تمہیں) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عن قریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوش خبری سنادو۔

یہ فتح ونصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی، اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دینِ الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ○ (توبہ:۹-۳۳)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورۂ فتح وسورۂ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے، یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آیندہ پوری ہونا ہے، اور یہ مسلمانوں کی دل جمعی اور اطمینان کا باعث ہے، لیکن اس کے پورے ہونے کے لئے مسلمانوں پر سعی وکوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جاچکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لئے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال:۸-۳۹)

اور ان لوگوں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

سارا حکم خدا کے لئے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی وجسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو، وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح ونصرت اور حصولِ غنیمت کی بشارت دی گئی ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَافِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ○ وَّمَغَانِمَ کَثِیْرَۃً یَّاْخُذُوْنَھَا وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ○ وَعَدَکُمُ اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِیْرَۃً تَاْخُذُوْنَھَافَعَجَّلَ لَکُمْ ھٰذِہٖ......وَّاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰہُ بِھَا وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا○
(فتح:۴۸-۱۸تا۲۱)

(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو صدق وخلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کرلیا، تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی، بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں، اور خدا غالب حکمت والا ہے، خدا نے تم سے بہت سی غنیموں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، تو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی......اور اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے، اور وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح وغنیمت جس کے بہ عجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے، وہ خیبر کی فتح ہے، جو بیعتِ رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے، چنانچہ اس سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوش خبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی:

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًامُّبِیْنًا○ (فتح:۴۸-۱)

اے محمد ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف۔

آنحضرت ﷺ جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس فتح ونصرت کے وعدہ کے پورے ہونے کے بعد عالمِ آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا:

اِذَاجَآءَ نَصْرُاللّٰہِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا○فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ (نصر:۱۱۰-۱تا۳)

جب اللہ کی مدد اور فتح آچکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ خدا کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہورہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت چاہو۔

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت، فرائض وحقوق کی ادائی، قلوب ونفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم وتربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہونچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بہ خود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گیا، اس موقع پر ایک شبہہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان، شرائع واحکام اور حقوق وفرائض اس کے لئے بہ منزلۂ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع وحقوق وفرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہِ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تا کہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل بہ آسانی کر سکیں، اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا	ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا
اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ	نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم وپائے دار کرے گا اور
خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا	خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے
(نور:۲۴-۵۵)	اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لئے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا، اُسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے، اس کی مسجد اس کا دیوان، اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگ جو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ ﷺ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت

سے نا آشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا(۱) کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی پادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا، اسی لئے اسلام دین و دنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شاہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمراں ہے اور وہی زمین پر فرماں رواں ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰـهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ. (زخرف:۴۳-۸۴)

اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔

وہ دیبیوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لئے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیبی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ، جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لئے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغازِ وحی کے زمانہ کی سورہ ہے(۲) مسلمانوں کو ہشیار کیا جاتا ہے:

وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (مزمل:۷۳-۲۰)

(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں، اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔

یہ جنگ کی پیشین گوئی اُس زمانہ میں سنائی جارہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ وسناں کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں

(۱) سیرت ابن ہشام، وفد رؤسائے قریش کی گفتگو ص ۱۸۰-۱۸۱ مطبوعہ محمد علی صبیح مصر۔ (۲) بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین باب صلوٰۃ اللیل ج ۱ ص ۲۷۸ مطبع دار الکتب مصر ۱۳۲۷ھ ہجری و بیہقی و حاکم و احمد۔

اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بہ زور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سر بکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی، سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لئے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ، اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر ہم کوئی کام نہ کریں گے، اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور ﷺ نے سورۂ فصلت کی آیتیں پڑھیں، جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آ گیا، اور واپس آ کر قریش سے کہا کہ خدا کی قسم محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ شاعری ہے، نہ جادو ہے، اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لئے تم محمد ﷺ کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی، اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے، تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد ﷺ نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں عرض کی۔

> ''اے محمد ﷺ! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے، تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو، تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ، اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں، اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے''۔

یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو

تمہاری دولت چاہئے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے، مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے، اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ تم کو اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لوگے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا، اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آجائے۔

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہوگیا کہ اسلام کا مقصد روم وایران اور حیرہ وغسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان وشوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح وآشتی سے آسانی سے قائم ہوسکتی تھی، اس کے لئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح، عالم کا اخلاقی وسیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نظام تھا جس کی وسعت میں دنیا ودین کی ہر چیز آجاتی تھی اور اسی لئے اس کے لئے عرب وعجم بلکہ جن وبشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابوطالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح ہوجائے، ابوطالب بھتیجے سے کہتے ہیں: جانِ عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں، وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور کچھ وہ تم کو دینا چاہتے ہیں، ارشاد ہوا: اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہوجائیں گے اور عجم اُن کے زیرنگیں ہوگا، ابوجہل نے کہا: ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بات نہیں، دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو، ان سے دست بردار ہوجاؤ (۱)

حج کے موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں "اے لوگو! کہو خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابعِ فرمان ہوگا، اور تم جنت میں بادشاہ بنوگے"۔ (۲)

بیعتِ عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسولِ انام علیہ السلام کے دست مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۵۲۔ (۲) طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۴۵، لائیڈن۔

سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے، اسعد بن زرارہ انصاریؓ نے حضور ﷺ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: ''لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ ﷺ سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لئے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! اب آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہو گا اس کو اس سے چھیننے کے لئے جھگڑا نہ کرو گے، اور جس سے تم اپنی اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہو، میری بھی کرو گے، انصار نے ایک آواز سے کہا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ! آپ کی یہ سب باتیں منظور، لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت اور فتح و نصرت۔(۱)

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی، اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا، یہاں تک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی مختلف موقعوں پر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوش خبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں، دم بہ دم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ اور جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر

(۱) طبقات ابن سعد جزء ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳۹، لائیڈن۔

سامنے آجاتا ہے جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں، حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں، اور حضور ﷺ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے، مداین تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدانِ جہاد اور بحرِ روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔ (۱)

لیکن ان خوش خبریوں، بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہئے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے موانع کو دور کرنے میں معین ہیں، اور اسلام کے حدود اور قانونِ عدل وانصاف کے اجرا کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت وطاقت، شان وشوکت اور مال ودولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش وعشرت، یہ دولت وحشمت اور جاہ ومال، سوئے مآل کا موجب ہو جائے گا، اسی لئے ضروری ہے کہ کر وفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت وحشمت، اور مال ودولت دنیا کی نہیں، بلکہ صرف آخرت کی آرایش کے لئے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے یہ کھیتی دنیا کے لئے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لئے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لئے فوز وفلاح کا موجب ہے۔

---

(۱) ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم ص ۵۸۷ تا ۶۱۸ طبع جدید ۱۹۹۸ء میں پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْلَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ○ (شوریٰ:۴۲-۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواست گار ہو، اس کو ہم اس میں دے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواست گار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِيْنَ○ (آل عمران:۳-۱۴۵)

اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے اور جو آخرت میں طالبِ ثواب ہو اس کو وہاں اجر عطا کریں گے، اور ہم شکر گذاروں کو عن قریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولتِ فانی کے پیچھے دولتِ باقی کو مت بھولو، کیوں کہ یہاں کی لذت، عیش وعشرت، آرام وراحت اور دولت وسلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (نحل:۱۶-۴۱)

اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے لئے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ○ (توبہ:۹-۳۸)

کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○ (قصص:۲۸-۶۰)

اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیا تم سمجھتے نہیں؟

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا○ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى○ (اعلیٰ:۸۷-۱۶و۱۷)

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو، حالاں کہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (اعراف:۷-۱۶۹)

اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں:

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (زمر:۳۹-۲۶)

پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھادیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے، کاش یہ سمجھ رکھتے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ۝ (طٰہٰ:۲۰-۱۲۷)

اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔

اگر آخرت کا خیال کئے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کرلے اور دنیا کے مال ودولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت وحشمت بے سود:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (ہود:۱۱-۱۵و۱۶)

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب وزینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتشِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انھوں نے دنیا میں کئے، سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرکاہ سے بھی کم تر ہے:

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (توبہ:۹-۳۸)

دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝ (رعد:۱۳-۲۶)

اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت، فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (آل عمران:۳-۱۸۵وحدید:۵۷-۲۰)

اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لئے برتنا چاہئے، جمعہ کے

خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے:

ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للاٰخرۃ — دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لئے ہیں:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (بقرۃ:۲-۲۹) — وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ اور خود انسان کس لئے بنا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ○ (الذاریات:۵۱-۵۶) — اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لئے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے، دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لئے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا (قصص:۲۸-۷۷) — اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔

انہی معنوں میں الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوش خبری دی گئی ہے، ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، فرمایا گیا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ — جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائے دار کرے گا، اور خوف کے بعد امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے، اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے، اور جو

الْفٰسِقُوْنَ ○ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

(نور:۲۴-۵۵، ۵۶)

اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں، اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔

خدا نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، تا کہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پروا ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میرے احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں، اور اگر اس امن واطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا، نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○

(حج:۲۲-۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور نیک کام کرنے کا حکم دیں، اور برے کاموں سے منع کریں، اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوقِ الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے، قائم کریں، اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے، ادا کریں، اور دنیا میں امورِ خیر کی تعمیل اور امورِ شر کے انسداد کا اہتمام کرسکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول، نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ ومنصب کا فریب، نہ عیش وعشرت کا دھوکا، اور نہ شان وشوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لئے جد وجہد اور سعی ومحنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت، اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ دیرپا تھی، چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سر پر غرور اب تک بلند تھا چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ ہجری میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی وتمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق ومغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ، اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے، اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی وشامی حدود پر آ کر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب وتمدن کا نام تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدودِ شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی، جس کے فرماں روا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدودِ شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آ گیا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو

چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظامِ سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظامِ سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظامِ زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالی جائے، بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی وتمدنی اثرات سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کی اطاعت وفرماں برداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض واعمال میں ترتیب وتدریج ملحوظ رہی ہے، اسی طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بہ تدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ﷺ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے آئے تھے، مگر آپ ﷺ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور ﷺ کے سامنے بھی اور آپ ﷺ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝ (بقرۃ: ۲-۱۴۳)	اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے بنو، اور رسول تمہارا بتانے والا بنے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لئے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت ورہنمائی اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے بہ روئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا، اور آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح وہدایت کے نذر ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر ویمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لئے آمادہ تھے، اور قبائلِ یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ ﷺ کو

قبیلہ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا، لیکن آپ ﷺ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دار الہجرت بنایا، وہ اگر چہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پرُ خطر تھا اور ابتدا میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لئے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ ﷺ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قائم ہو گیا، اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا، اور وہ فتح ہو گیا، تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا، اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو وسعت دی گئی، اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت روسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ نے ان حصوں میں بھی یہی طریقۂ دعوت اختیار فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے قرب و جوار کے سلاطین و روساء کو اسلام کی دعوت دی، کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبولِ اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپ ﷺ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدمِ قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا، اس سے اگر چہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصع اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہ حبش نے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی، اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے تمام روساء نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں اگر چہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا، تاہم غزوۂ تبوک نے آپ ﷺ کے جانشینوں کے لئے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا، اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظامِ حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت ﷺ کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

ان الزمان قد استدار کهیئته یوم خلق الله السموٰت والارض (۱)	زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

(۱) ابوداؤد کتاب المناسک، باب الاشهر الحرم ج ۱ ص ۱۹۴۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خودساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظام ہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ وقیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ واذا	جب کسریٰ ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں، اور
ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ (۱)	جب قیصر ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون، جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیوں کہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی، لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھی، یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگراں وحاکم ہے، شوہر اپنے اہل وعیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ (۲) یعنی تم میں سے ہر شخص نگہ بان ہے، اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا، یہی مطلب ہے، اس سے اسلام کے اصول سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے، اور لاکھوں کو تہِ تیغ کر کے اپنی طاقت وقوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر، ہزاروں گھروں کو ویران کر کے، سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے، اور ان تمام خوں ریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ وجہاد اور اسلامی نظامِ سلطنت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمح نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندانِ قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص وہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہِ ارض وسما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سرافگندگی۔

---

(۱) بخاری باب علامات النبوۃ ج ۱ ص ۵۱۱، ومسلم کتاب الفتن ج ۲ ص ۵۰۷ وغیرہ۔ (۲) صحیح بخاری کتاب الجمعۃ باب الجمعۃ فی القری والمدن ج ۱ ص ۱۲۲ وغیرہ۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بہ جائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی وسماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو، اور جس میں فرماں روا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدو جہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریقِ حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے ہو۔

اسی مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لئے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے، جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے، اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا، اور اس کے لئے ایسی ہی درمیانی ہم سایہ قوم کی ضرورت تھی، اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظامِ سلطنت کو مٹانے کے لئے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی، اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی، عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز قوت ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومتِ اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں، اور ان اوصاف کی جلا، اخلاص، للّٰہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرا اخلاقِ روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لئے اولاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا، جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب و اقتدار، اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لئے اختیار کر رکھا تھا، مذکورۂ بالا اخلاقی محاسن کے وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشو و نما کی صورت ایک ہی تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامور من اللہ، ایک پاک باز رہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرِ توِ صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نورِ ایمان پیدا کیا جائے، جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکامِ الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں:

(۱) یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

(۲) یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں، بلکہ اس کا اساسِ اولین محض اخلاصِ قلب اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا، اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا، اس نظامِ سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے، اونچ نیچے، کالے گورے، اور عربی وعجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد وحجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر آکر کھڑے ہو گئے اور بادشاہی وشہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق ومغرب میں بچھے تھے الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہل کار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی، کیوں کہ اہل عرب فطرتاً خود دار تھے، اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی، اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں، جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا، اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی، قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت وفیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کئے جاتے تھے، لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سردارانِ قبائل کے لئے خاص حقوق مقرر تھے، جن سے اور تمام لوگ محروم تھے یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فقول کہتے ہیں، اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے، عام مجالس میں لوگوں کو سردارانِ قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا، کہتا ہے:

وننكر ان شئنا على الناس قولهم	ولا ينكرون القول حين نقول
اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں	اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے

سردارانِ قبائل اپنے لئے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حربِ بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے:

لاحمیٰ الا للہ ورسولہ(۱) اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان وتجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر وجواہر کے زیوروں سے آراستہ ہوکر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے، ان کے امراء علی قدرِ مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لئے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس وفرش حرام کئے گئے، سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لئے ناجائز ٹھہرے، امامِ وقت اور اس کے حکام کے لئے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا، حاجب ودربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش ونقیب رخصت کردیے گئے، طلائی ونقرئی وزمردیں تخت اٹھوا دیے گئے، امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے، اور پستی وبلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع ولباس کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لے کر آئے چوں کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! آپ اسے خرید لیں، تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ ﷺ کی خدمت میں آئیں تو آپ ﷺ اس کو زیبِ تن فرمالیں، یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربارِ عام کا دن ہے آپ ﷺ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لئے اس ظاہری جاہ وجلال اور تزک واحتشام پر گئی، جس کے شاہانِ وقت عادی تھے، لیکن حضور ﷺ نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کردیا، کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ وجلال کے اظہار کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے، آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے (۲)۔

اس طرح نشست میں بھی آپ ﷺ نے تفوق وبرتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ ﷺ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد ﷺ کون ہیں، لوگ

(۱) بخاری کتاب الجہاد باب اھل الدار یبیتون الخ ج ۱ ص ۴۲۳۔ (۲) بخاری کتاب الجہاد باب التجمل للوفد ج ۱ ص ۴۲۹۔

اشارہ سے بتاتے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنادیا جائے جس پر آپ ﷺ جلوہ افروز ہوں، مگر آپ ﷺ نے اس کو بھی پسند نہیں فرمایا (۱)۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانونِ الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لئے دوہری سزا ہے، ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چوں کہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ کو یہ گراں گذرا اور انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی، مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے، پھر فرمایا کہ اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا (۲)۔

ایک بار آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت ﷺ کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپ ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ ﷺ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا، آپ ﷺ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے معاف کردیا (۳)۔

ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکی پیتے پیتے چھالے پڑ گئے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں (۴)، ابطالِ سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا

---

(۱) ابوداؤد کتاب السنۃ باب القدر ج ۲ ص ۶۷۱ پر ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بعد میں ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنادیا تھا۔ "ع"۔

(۲) یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے، مثلاً کراھۃ الشفاعۃ فی الحدود اذا رفع الی السلطان ج ۲ ص ۱۰۰۳۔ (۳) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۶۲ کتاب الدیات باب القود بغیر حدید۔ (۴) ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب فی بیان مواضع قسم الخمس ج ۲ ص ۲۳۔

جب قانونِ عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا معاف فرمایا(۱)، اسلامی محاصل زکوٰۃ وصدقات وعشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اوران کی ادائیگی میں خاندانِ نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کردیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بہ خلاف اس کے حضور ﷺ نے اپنے لئے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کاملہ ہی آپ ﷺ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ وہمی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ ﷺ نے ان سب کو مٹادیا، فرمایا: خدا کے نزدیک سب سے برانام یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو شاہِ شاہاں کہے(۲)، ایک دفعہ آپ ﷺ کو کسی نے سیدنا کہا، تو فرمایا: یہ تو اللہ کے لئے ہے(۳)، آپ ﷺ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ ﷺ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دیں۔(۴)

ایک بار سورج میں گہن لگا، چوں کہ اسی دن آپ ﷺ کے صاحب زادہ ابراہیمؓ کا انتقال ہوچکا تھا، اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لئے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؓ کی موت کی طرف منسوب کردیا، لیکن جب آپ ﷺ صلوٰۃِ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا، جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چانداور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا۔(۵)

ایک بار ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔(۶)

ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمد ﷺ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ حق کس کا تھا(۷)، حالاں کہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی ﷺ ج۱ص۳۹۶۔ (۲) بخاری کتاب الادب باب ابغض الاسماء ج۲ص۹۱۶ (۳) ابوداؤد کتاب الادب باب کراھۃ التمادح ج۲ص۶۶۲۔ (۴) بخاری کتاب الانبیاء ج۱ص۴۸۵۔ (۵) ایضاً باب الکسوف ج۱ص۱۴۲۔ (۶) ابن ماجہ ابواب الاطعمہ باب القدید ص۲۴۶ (۷) مسند ج۳ص۴۳۵ مسند اسود بن الشریح

دی جا سکتی تھی، کہ اس سے ان کے نزدیک ذاتِ شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے، حالتِ نماز ہی میں ایک بدو نے کہا، ''خداوندا! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر''۔ آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ ''تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمتِ الٰہی کو محدود کر دیا''۔(۱) حالاں کہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطینِ زمانہ اکرام وانعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات ومحاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی وخاندانی عیش وآرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا، اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے، لیکن جو نظامِ سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے، اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے، اور مسلمانوں ہی کے لئے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بہ حیثیت امیرِ سلطنت سب کا سب آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو اپنا نہیں بلکہ بہ اختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندانِ ہاشم پر حرام فرما دی، اور اس کو بہ حکمِ الٰہی عام غربا اور اہل حاجت کا حق قرار دیا، اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداؤد میں ہے:

قال ما اوتیکم من شیئٍ وما امنعکم ان انا الا خازن اضع حیث ما امرت (۲)

میں تم کو نہ کچھ دے سکتا نہ کچھ روک سکتا ہوں، میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔

دوسرے موقع پر فرمایا:

انما انا قاسم وخازن واللہ یعطی (۳)

میں تو صرف بانٹنے والا اور محافظ ہوں، دینے والا تو خدا ہے۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا، اور حضور ﷺ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور ﷺ اپنے اہلِ بیت کے

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۸۸۹، کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبھائم۔ (۲) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵، کتاب الخراج والامارۃ۔ (۳) بخاری کتاب الجہاد وباب قول اللہ تعالیٰ فان للہ خمسہ ج ۱ ص ۴۳۹۔

علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مالِ غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا، لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی آمدنی اپنے صواب دید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کے ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے، اور اعلان فرما دیا تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لئے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے، چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بہ جائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے، جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں، اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! میں کیوں نہ روؤں، جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشتِ مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے، ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں، ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں بے شک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! دعا فرمایئے، کہ خدا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو فارغ البال کرے کیوں کہ رومی اور ایرانی باوجودے کہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم دفعتاً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: ”کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو، رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا

ہی میں دے دیے گئے ہیں۔''(۱)

اس تقریر دل پذیر کی تاثیر دیکھئے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور ﷺ کے لئے تزک واحتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع (۲) ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زرو جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس بن سعدؓ ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت ﷺ سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں، اسی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گذرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں! تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہئے (۳)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضور ﷺ کو سجدہ کیا، آپ ﷺ نے حیرت سے فرمایا: معاذ! یہ کیا؟ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو دل چاہا کہ میں بھی حضور کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں (۴)۔

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب وجوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک واحتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیضِ اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں، اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمایش اور حباب کی سربلندی سے زاید نہیں، اللہ تعالیٰ

---

(۱) بخاری و مسلم کتاب النکاح باب الایلاء، دوسری روایت بخاری کے باب موعظۃ الرجل ابنته لحال زوجها ص ۷۸۲ سے ماخوذ ہے۔ (۲) یعنی پیوندار کپڑا (معارف جلد ۱۲ اعدد ۳ ص ۱۸۱)۔ (۳) ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المراۃ ج ۱ ص ۲۱۲۔ (۴) ابن ماجہ کتاب النکاح باب حق الزوج علی المراۃ ج ۱ ص ۳۲۷-۳۲۸

نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، اور آنحضرت ﷺ نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی کی پیروی کی، اور یہی سادگی وتواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطاو بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امرا کے موروثی استحقاق اور سعی وسفارش کی بنا پر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقرا کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے احکامِ الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا، کیوں کہ ضعفا کا حق اقویا کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ یمنی مہرے تھے، آپ ﷺ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا (۱)۔

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات وتصنعات اور غلامی وعبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرفِ مدعا زبان پر آتا تھا، اسلام کے نظامِ حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور ﷺ کی عظمت وجلالت اگرچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بارگاہِ نبوت میں ایک طائرِ بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمد کہہ کر خطاب کرتا اور حضور ﷺ خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے، اور مسلمان یا رسول اللہ ﷺ کہہ کر مطلب شروع کرتا تھا، آپ ﷺ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضور ﷺ کا یہ حکم بہ طور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضور ﷺ اس کو شفقت سے سنتے تھے، اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علاحدگی

(۱) دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الخراج باب قسم الفئی ج ۲ ص ۱۵ میں ہیں۔

اختیار کرلی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں، سفارش ہے، عرض کی تو قبول سے معذور ہوں (۱)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فنِ جنگ کے بعض ماہر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے، انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے، بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہئے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا (۲)، اسی قسم کی تجربی امور کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

انتم اعلم بامور دنیاکم — تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لئے کرتے ہوں گے، اس لئے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گذر ہوا تو دریافت فرمایا، انہوں نے صورتِ حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے، میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہی ہوں تم آزاد ہو (۳)۔

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن جن امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحتِ خداوندی پر مبنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور کو بہ ذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہوسکتا تھا،

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الطلاق باب خیار الامۃ تحت العبد وباب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرہ ج ۲ص ۷۹۵۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اور اگر آزاد ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ (۲) سیرت ابن ہشام ج ۱ص ۳۷۸۔ (۳) صحیح مسلم کتاب الفضائل باب وجوب امتثال ماقالہ شرعاً الخ ج ۲ص ۳۰۵

کیوں کہ ان کا منشا حکمِ الٰہی ہوتا تھا، جس کا ماننا ہی ضروری ہے، اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ نے نہایت نرم شرائط پر صلح کرلی تو حضرت عمرؓ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لئے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہوگئے، اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شبہ ہوں، انہوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شبہ ہیں، انہوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا، انہوں نے کہا کہ کیا آپ ﷺ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانۂ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انہوں نے کہا، نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے، لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال وجواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انہوں نے بھی وہی جواب دیے جو رسول اللہ ﷺ نے دیے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض ومعروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا (۱)، اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض معروض کی مگر حضور ﷺ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا، کیوں کہ یہ فیصلہ اراءتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اسی طرح اسی واقعہ میں حدیبیہ میں جب شرائطِ صلح طے ہوجانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چوں کہ ان کے شدت شوقِ زیارت کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لئے ان کو حزن وملال ہوا، اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضور ﷺ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے، اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے، لیکن جب آپ ﷺ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحتِ ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت ﷺ پر شاق گذرا اور مغموم ہوکر ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے، ام المومنین نے چہرۂ مبارک پر آزردگی کا اثر پاکر سبب دریافت کیا، آپ ﷺ نے واقعہ بیان فرمایا، حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ!

(۱) بخاری ج ۱ ص ۳۸۰ کتاب الشروط۔

آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، آپ خود اپنا احرام کھول دیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا، شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہ رضی اللہ عنہم) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضور ﷺ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے (۱)۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چوں کہ امرِ الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی، اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امور تجربیہ سے تھا، اس لئے اس پر بلا تامل عمل فرمایا (۲)۔

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضور ﷺ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضور ﷺ نے اس پر تحمل فرمایا، اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری صحابیؓ میں آب پاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا، اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں، اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا، قانونِ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنویں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے، لیکن آپ ﷺ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آب پاشی کر لو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کی کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے، اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپ ﷺ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آب پاشی کر کے پانی روک لو،

---

(۱) بخاری کتاب الشروط ج ۱ ص ۳۸۰ (۲) اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدانخواستہ علم النفس کا یہ نکتہ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان (استادوں) کو اس لئے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں، اس لئے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے (۱) یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسروں کے کھیتوں میں ازخود چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مالِ غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنوتمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ انصاف فرمائیے! آپ ﷺ نے فرمایا، اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمرؓ کو غصہ آ گیا، اور آنحضرت ﷺ سے کہا! اگر آپ ﷺ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ نے ان کو روک دیا (۲)، اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہم راہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے، (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علیؓ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)۔

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرضِ واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے، اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چیں منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے برے اسلوب سے بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت ﷺ اپنے کرم وشفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت ﷺ کے اس طرزِ عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفا اور امرائے اسلام کے لئے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ واعزاز اور فخر وغرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمال وحکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں، اس لئے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمالِ نبوی کی شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو، یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال سے فرمایا: ”ہاں! مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا، کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی، اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو“ (۳)

---

(۱) ابوداؤد کتاب الاقضیۃ ج۲ ص۷۶ باب من القضاء (۲) بخاری ج۱ ص۵۰۹ باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

(۳) صحیح مسلم ج۱ ص۳۶۶، کتاب الزکوٰۃ باب ارضاء السعاۃ۔

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور ﷺ سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، اور آنحضرت ﷺ نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا، اور عدل وانصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آ کر آپ ﷺ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ ﷺ کی گردن سرخ ہوگئی، آپ ﷺ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیوں کہ جو لاد دو گے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا، حضور ﷺ نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، اس کے بعد فرمایا: میں اس وقت تک نہیں لاد دوں گا، جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے اس کا بدلہ نہ دو، مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپ ﷺ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔(۱)

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرض آنحضرت ﷺ پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا، اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہم کلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہئے، کیوں کہ اس کا حق ہے، اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا (۲)۔

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت ﷺ کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپ ﷺ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ بدمعاملگی کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، اس کو چھوڑ دو اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ ﷺ نے پھر فرمایا: اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے، اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب الحلم واخلاق النبی ﷺ ج ۲ ص ۱۸۱۔ (۲) ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان ص ۴۳۸

آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم وعفو اور حسنِ معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی، اور اچھی دی (۱)''۔

بہر حال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بے ہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعادِ ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی، اور سخت وسست کہہ کر کہا'' کہ اے عبد المطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو''، حضرت عمرؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کر کے کہا: او خدا کے دشمن! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا: عمرؓ! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہئے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہئے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں، یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ! اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو، یہودی حلم وعفو کے اس پر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا (۲)۔

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا، اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا، مطلب یہ ہے کہ میرا مال یوں ہی اڑا لیں اور دام نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں (۳)۔

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا،

---

(۱) مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۶۸۔ (۲) یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفا از شہاب خفاجی ج ۲ ص ۱۳۱ فصل حلم)۔ (۳) جامع ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی الرخصۃ فی الشراء الی اجل ج ۱ ص ۲۳۰۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا، اور معاملہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کردی، ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امراء کے غرور و تجبّر سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرت ناک سزائیں دیتے ہیں، اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذاتِ شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار و گیر سے برتر ہے، اس سے بھلا برا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دار و گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصلِ جہنم کر سکتی تھی، با ایں ہمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لئے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسوہ آیندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لئے عملی سبق ہو، اور اس کے لئے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے، تاکہ آیندہ آنے والے امراء اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہدِ نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں ان میں ایران نے کبھی ذاتِ شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب، استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روما میں کسی زمانے میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں، لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراء کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا، اور نہ ان کو امراء کے مقابلہ میں یہ حقِ سوال مواخذہ حاصل تھا، اور نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع، اس خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا، اور نہ آ سکتا تھا، وہ اخلاصِ قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا، اور وہ اس کے پجاری تھے، اور وہ اس دیوتا کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے، اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا، جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت

نہیں ہے، بلکہ اس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشم ادب کا سرمہ تھی، اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی، بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت وامارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم عقل ودانش اور علم وفہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل وفہم اور علم ودانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ کرتے تھے، ایک تو اس لئے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے، اور دوسرے اس لئے کہ چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفا وامرا کے لئے مثال ونظیر کا کام دے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران:۳-۱۵۹) (اے رسول! امورِ سلطنت وجنگ وصلح میں) اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہ نفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی، اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ:۴۲-۳۸) ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

اگرچہ عہدِ نبوت میں حکومت کے سارے اجزا وجود پذیر نہیں ہوئے تھے، اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع واستقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، اور ان کی رایوں پر عمل کیا، اور اس کا منشا صرف یہی ہوسکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ

یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیوں کر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی، اس لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، یہود ونصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق وناقوس بجایا جاتا تھا، بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپ ﷺ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے، تو آپ ﷺ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا، اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا، انہوں نے اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ کہہ کر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت ﷺ کو رویا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی (۱) اور فیضِ تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا، (۲) اور آکر آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہؓ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک انصاری رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑے ہم تو یہیں رہیں گے، خدا کی قسم اگر آپ ﷺ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے، (۳) اس کے بعد جب آپ ﷺ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ حسبِ فرمانِ الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور ﷺ کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے، اس پر انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہئے تا کہ پانی اپنے قبضہ میں رہے، آنحضرت ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہیں جا کر قیام فرمایا (۴)۔

---

(۱) مصنف عبد الرزاق وطبقات ابن سعد وکتاب المراسیل لابی داؤد وفتح الباری ابن حجر وروض الانف سہیلی وزرقانی علی المواہب ونووی شرح مسلم باب بدء الاذان ج ۱ ص ۱۶۴ نووی میں ہے فشرعه النبی ﷺ بعد ذلک اما بوحی واما باجتهاده ﷺ علی مذهب الجمهور فی جواز الاجتهاد له ﷺ ولیس هو عملاً بمجرد المنام هذا مالا شک فیه بلا خلاف۔ (۲) ابوداؤد وترمذی ابواب الصلوٰۃ باب بدء الاذان ج ۱ ص ۴۸۔ (۳) سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۵۔ (۴) سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۸۔

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپ ﷺ نے پھر تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا (۱)۔

احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافقِ مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پرجوش جاں نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور ﷺ شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہئے، اور حضور ﷺ کا صحابہؓ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا سامنا کرنا امورِ حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ حنین میں جب قبیلۂ ہوازن کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپ ﷺ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا، ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول کر لی، اگرچہ آنحضرت ﷺ کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ ﷺ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں، اب تم میں سے جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو، وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں، جس وقت پہلا مال غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا، تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ ''یارسول اللہ ﷺ! ہم اس پر راضی ہیں'' آپ ﷺ نے ان کے اس عاجلانہ اظہارِ رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا، کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے، کہ کون راضی ہے، اور کون راضی نہیں ہے؟ اس لئے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام و عریف ہمارے پاس بھیجنا چاہئے، چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ ﷺ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی (۲)۔

احادیث کی کتابوں کا استقصا کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، جن سے ثابت

---

(۱) ترمذی، کتاب التفسیر سورہ انفال ج ۲ ص ۱۳۹ بر حاشیہ۔ (۲) ابوداؤد کتاب الجھاد باب فی فداء الاسیر بالمال ج ۲ ص ۳۶۷ و صحیح بخاری کتاب المغازی۔

ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے عہدِ مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے، اوران کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے توان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیامِ سلطنت اورآئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اورعبادت بنادیا، اس شعبۂ حیات کو جس میں تمام تر درندگی، بہیمیت، مکروفریب، دغل وسازش، ظلم وستم اور جوروتعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک وبلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابہ کرامؓ سے روایت ہے کہ:

السلطان ظل الله فی الارض یاوی الیه کل مظلوم من عباد الله (۱)

یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے، جس کے دامن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے کہ:

السلطان العادل المتواضع ظل الله ورمحه فی الارض (۲)

عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا سایہ اوراس کا نیزہ ہے۔

خود حضور ﷺ نے فرمایا: ''عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا''۔

جولوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اورنیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسنِ عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا، جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

---

(۱) و (۲) یہ حدیث اثر کے طور پر بہ اختلاف لفظ بروایت ابوہریرہؓ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمرؓ بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیقؓ ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور ﷺ تک مرفوع نہیں، بہ ظاہر ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفاء ومزیل الالباس اسمٰعیل عجلونی جلد اول ص ۴۵۶ مکتبہ قدسی ۱۳۵۱ھ ہجری۔ لفظ سلطان، یہاں یہ یادرکھنا چاہئے کہ قدیم عربی میں السلطان کے معنی بادشاہ کے نہیں بلکہ طاقت وقوت کے ہیں، جوانگریزی لفظ 'پاور' (Power) کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مرادف ہے، اس لئے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظامِ حکومت مخلوقاتِ الٰہی کے آرام وآسائش کے لئے گویا زمین میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ عمالِ حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں، سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے: السلطان ولی من لا ولی له یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہواس کا ولی سلطان ہے یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے، اس لئے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا، بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی، اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدی وظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا، امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کرلی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لئے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا، اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے، جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہئے، یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹالی (١)۔

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گذاری اور خراج کے وصول کرنے کے لئے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعتاً سلطنت کا خزانہ خالی ہوجاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کے خدع وفریب، مکر وحیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصی وجمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری ونمایشی تمدن وتہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے، تمام ملک میں تعلیم عام ہوگئی ہے، ہر فرد رموزِ سیاست سے واقف ہوگیا ہے، اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہوگیا ہے، لیکن بااین ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بہ خوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا، مجرموں کا بھی یہی حال ہے، کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہوجاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لئے ہزاروں لاکھوں خرچ کردیتے ہیں، باجودے کہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے، اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لئے دی جاتی ہے، لیکن بااین ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت ودلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے، اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے، تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجبِ عذاب وثواب سمجھتا ہے، اس لئے ان پر بلا جبر واکراہ عمل کرتا ہے، اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہوسکتا ہے، اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی

---

(١) سنن ابی داوٗد کتاب الجهاد باب فی الامام یکون بینه وبین العدو عهد الخ ج ٢ ص ٣٧٩-٣٨٠۔

اصول پر قائم تھا، اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ وزکوٰۃ عرب کے لئے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس وغربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہؓ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بہ ظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ وزکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اورزکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں عمال مقرر کردیے گئے تھے، تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر وسررشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کردی جاتی تو اس کو صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظامِ سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاکر پیش کرتا تھا، اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتاہ قوم بصدقتھم قال اللّٰھم صل علیٰ آل فلان فاتاہ ابی بصدقتہ فقال اللّٰھم صل علیٰ آل ابی اوفیٰ (۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ خداوندا! فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خداوندا! ابواوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج۔

حضرت عدیؓ بن حاتم قبیلۂ طے کے سردار تھے، اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھ ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سردارانِ قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے ان ہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا:

ان اوّل صدقة بیضت وجه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووجوه اصحابه صدقة طے جئت بها (۲)

پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کا چہرہ چمک اٹھا قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔

---

(۱) بخاری کتاب الزکوٰۃ باب صلوٰۃ الامام ودعاءہ لصاحب الصدقة ج ۱ ص ۲۰۳۔ (۲) مسلم کتاب الفضائل باب فضائل غفار واسلم الخ ج ۲ ص ۳۶۷۔

قبیلۂ بنوتمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

صدقات قومنا(۱)　　یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تھی، حضرت ابومسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے، اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لا کر صدقہ میں دیتے تھے(۲)۔

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے، لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نورِ ایمان سے چمک اٹھتے تھے، اور اس داغ کو دھونے کے لئے بے تاب ہو جاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہِ نبوت میں آ کر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے، اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں، مثلاً چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں، یا سنگ سار کیا جاتا ہے، تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، اور یہی حکمت لوگوں میں اعترافِ جرم کا جذبہ پیدا کرتی تھی، اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے، اپنے جرموں کا ازخود اعتراف کرتے تھے، اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے، انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ازخود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! مجھے پاک کیجئے، (صحیح مسلم باب الرجم) یا رسول اللہ مجھ پر حد جاری فرمائی جائے، آپ ﷺ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے، مجھ پر حد جاری فرمایئے، اسی طرح وہ بار بار اعترافِ جرم کرتے رہے، اور آپ ﷺ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے؟ انہوں نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انہوں نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انہوں نے کہا: ہاں، ان تمام مراتب کے بعد آپ ﷺ نے ان کے سنگ سار کرنے کا حکم دیا، جب ان

(۱) مسلم کتاب الفضائل باب فضائل غفار واسلم الخ ج۲ ص ۳۶۸۔ (۲) صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ ص ۱۹۰ و کتاب الاجارۃ باب من آجر نفسہ ص ۳۰۳۔

پر پتھر برسنے لگے تو انہوں نے بھاگنا شروع کیا، بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر مارا اور وہ وہیں ٹھنڈے ہوگئے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتے اور خدا ان کی توبہ کو قبول کر لیتا (۱)۔

اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے، اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انہوں نے از خود اپنے تیمار داروں سے اس کا اقرار کیا، اور ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو، چنانچہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا، حضور ﷺ نے ان کی شدتِ علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی (۲)۔

کعب بن عمروؓ ایک اور صاحب کا واقعہ ہے، جنہوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہم بستر نہیں ہوا، تو یہ گنہ گار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے (۳)۔

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرف دار رئیس خدمتِ اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت ﷺ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسری طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں، ایک نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضور ﷺ نے دیت ہی پر زور دیا، یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے، میری مغفرت کے لئے دعا فرمائیے (۴)۔

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حد فاصل قائم کر دیتے

---

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۵ اور صحیح بخاری کتاب الحدود ج ۲ ص ۱۰۰۶۔ (۲) ابوداؤد کتاب الحدود باب فی اقامۃ الحد علی المریض ج ۲ ص ۱۵۱۔ (۳) ایضاً باب یصیب الرجل دون الجماع ص ۱۵۰-۱۵۱ و صحیح بخاری حدود۔

(۴) ابوداؤد کتاب الدیات باب الامام یامر بالعفو فی الدم ج ۲ ص ۱۵۴-۱۵۵

ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لئے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماعزؓ اور دوسرے صحابہ نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجرا سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے اور آنحضرت ﷺ کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہوجائیں گے، دنیوی سلطنت میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہ نے ماعزؓ پر اس لئے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکمِ الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی، دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظامِ سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرزِ عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہوجاتا ہے، جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لئے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کرسکتی ہے، بڑے بڑے جرائم سے درگذر کرسکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرسکتی ہے، لیکن وہ کسی بدخواہِ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہدِ نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کئے جن سے بہ ظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چوں کہ ان کی نیت صاف تھی، اور ان کے دل پاک تھے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہوچکی تھی، حاطبؓ بن بلتعہ ایک صحابی تھے، انہوں نے کفارِ قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑادوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے حاطبؓ سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطبؓ نے کہا کہ خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے، اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہیں تھا، اس لئے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کردوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہوجائے، آپ ﷺ نے فرمایا: سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو، لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑادوں، لیکن آپ ﷺ نے

فرمایا: کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر خدا نے اہلِ بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

اعملوا ما شئتم فقد وجبت لکم الجنة — جو چاہو کرو، کیوں کہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جاچکی۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول ﷺ کو سب سے زیادہ علم ہے(۱)۔

آنحضرت ﷺ نے حاطبؓ بن بلتعہ کے معاملے میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ شرکتِ بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی، اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جاسکتا ہے، سیاست کا ایک لازمی جز بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دوراندیش خیال کیا جاتا ہے، جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز واقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے، اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم ومحکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دارو مدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص واعتماد کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے حاطبؓ بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت ﷺ نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

حسن الظن من حسن العبادة (۲) — حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کردیا ہے:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (حجرات: ۴۹-۱۲) — بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے:

ان الامیر اذا ابتغیٰ الریبة فی الناس افسدھم — جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کردے گا۔

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویة قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم او کدت ان تفسدھم — حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کردیا، یا عن قریب برباد کردوگے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہؓ کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا

(۱) بخاری ج ۲ کتاب المغازی باب فضل من شھد بدرا ص ۵۶۷۔ (۲) ابوداود کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۸۔

رہا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا، اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چوں کہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لئے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے، البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے، اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں (۱)۔

دخین حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کے منشی تھے، انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہم سایے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لئے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ ''درگذر کرو'' دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترکِ شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ درگذر کرو، کیوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ:

من رأى عورة فسترها كان كمن احيىٰ موؤدة (۲)

جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپالیا، اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچالیا، جو زندہ درگور کردی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہوسکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑسکتا ہے، ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لئے مضر ہے، اور اس کو اکثر برباد کردیتا ہے، اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قولِ نبوی ﷺ میں ملتا ہے، اس لئے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے اس مضمون کا خلاصہ نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''جاننا چاہئے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن،، ڈیل ڈول، وسعتِ علم، حسنِ خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگراں ہے، اس لئے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو، اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہو، اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے اسی کا نام

---

(۱) یہ تمام حدیثیں ابوداؤد ج ۲ کتاب الادب باب فی النهی عن التجسس ص ۱۹۰ میں ہیں۔ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی الستر علی المسلم ج ۲ ص ۱۹۰۔

بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے، اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لئے مضر اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطنت کی خوبیوں کا تمام تر دارومدار نرمی پر ہے، کیوں کہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف وذلت طاری ہو جاتی ہے، اور لوگ اس سے بچنے کے لئے جھوٹ اور مکروفریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں، اور پھر ان کا ضمیر اور نظامِ اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلوتہی کرتے ہیں، اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں، اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے، اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگذر کرے، تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں، اس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کی محبت میں شرابور ہو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم وتوابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں، مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کے معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے، اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہئے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے، بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چوں کہ دوررس ہوتی ہے، اور وہ ابتدا ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لئے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں''۔

اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو، اور حاکم کے لئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو، چنانچہ حضرت عمرؓ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ''یہ کچھ نہیں میں نے تم کو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا'' (۱)۔

ابن خلدون نے ان سطروں میں جو آئینِ جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون فصل فی ان ارھاف الحد مضر بالملک ص ۱۵۷-۱۵۸۔

میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس طرزِ عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی، اور احکامِ سلطنت کے عدمِ تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے، اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث، اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو قانونِ شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں امن واطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو، عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر وغریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثباتِ جرم میں شکوک وشبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے، اور قساوت اور سنگ دلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم وجابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں، ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

ان اللہ یعذب الذین یعذبون فی الدنیا — بے شبہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

صحابہؓ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم وستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت ﷺ کا فیضِ صحبت اٹھایا تھا، انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا، ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے ہیں، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے، انہوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں (۱)۔

دنیوی حکمران لطف ومحبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوم کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظامِ سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف ومحبت اس کا خمیر تھا، اور اس لئے یہ ابرِ کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملاتِ حکومت میں خود آپ ﷺ کا

(۱) مسلم ج۲ص ۳۹۷، کتاب الادب باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق

طرزِ عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کردیں گے، مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت ﷺ کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیے، کیوں کہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں (۱) یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمایئے، آپ ﷺ نے پوچھا: کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اس نے کہا ہاں، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ خدا نے معاف کر دیا (۲)۔

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ کو اپنے کام کے لئے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی، ایک بار ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا تم اپنے کام کے لئے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں، چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا (۳)، عدیؓ بن حاتم جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے، جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضور ﷺ بادشاہ ہیں، یا نبی ہیں، لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اٹھے کہ حضور ﷺ بادشاہ نہیں، کیوں کہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جاسکتا ہے، اور اس کے بعد فوراً آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے، اور حضور ﷺ ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک بدو نے ایک دفعہ آپ ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ ﷺ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا (۴) بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو

---

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۹، کتاب الحدود باب فی رجم الیہودیین (۲) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۱-۱۴۲ کتاب الحدود باب فی الرجل یعترف بحد ولا یسمیہ، جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لئے بحکم اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ اس قصور کی معافی کی خوش خبری دی گئی (۳) مسلم ج ۲ ص ۲۹۴ کتاب الفضائل باب فی قرب النبی ﷺ من الناس الخ

(۴) بخاری ج ۲ ص ۹۰۰ کتاب الادب باب التبسم والضحک۔

جاتے تھے جن کے لئے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگ دستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے، تو آنحضرت ﷺ بیت المال سے ادا فرمادیتے تھے، ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہوجائے، اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کرلیا (۱) لیکن آخر ایک رات (۲) کو بے قابو ہوکر بیوی سے مباشرت کرلی، صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا، تو خود تنہا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر جرم کا اعتراف کیا، آپ ﷺ نے دوبار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟ انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی: ہاں! ہاں! یارسول اللہ ﷺ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی، اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا: ایک غلام آزاد کردو، انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یارسول اللہ ﷺ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو، عرض کی یارسول اللہ ﷺ جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو، عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپ ﷺ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقۂ بنوزریق کے عامل کے پاس جاؤ، وہ تم کو اس قدر کھجور دے دے گا کہ اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہ ﷺ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا (۳)۔

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کردی تھی جس کی جھلک سلاطینِ دنیوی کے تاج ہائے مرصع اور ان کے لباس ہائے فاخرہ میں نظر نہیں آسکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں، اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے، کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظامِ سلطنت کبھی قائم ہوا ہے، اور نہ ہوسکتا تھا، لیکن

(۱) ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرماتِ شرعی سے تشبیہ دے دی جائے، جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں کے برابر ہے، اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔ (۲) اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

(۳) ابوداؤد ج ا ص ۲۲۰، کتاب الطلاق باب فی الظهار۔

جب اسلام کا نظامِ سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کئے گئے تو ان ہی خودسر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوشِ عقیدت کے ساتھ قبول کرلیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہوسکتا ہے، جو عہدِ نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال الجھے ہوئے، اور اسی حالت میں خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا، اور شریعت کے احکام پوچھے، فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا: نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو، پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا: نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوٰۃ کا ذکر فرمایا اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو، اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم میں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہو گیا اگر سچا نکلا (۱)۔

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے، کہ ایک بدو نے آکر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہیں اور آپ ﷺ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا، اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے کہا: زمین اور پہاڑ کس نے بنائے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے پھر کہا: ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: اللہ عزوجل نے، اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور ان میں فائدے رکھے، کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا: ہاں، اس نے پھر عرض کی کہ آپ ﷺ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں، اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا، کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا کیا خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: بے شک! پھر کہا: آپ ﷺ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ہاں! سچ کہا، اس نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپ ﷺ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپ ﷺ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کہا: آپ ﷺ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانۂ کعبہ کا حج کریں، فرمایا: ہاں! سچ کہا، عرض کی اس کی قسم جس نے آپ ﷺ کو بھیجا، کیا خدا نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا: ہاں! اس نے عرض کی قسم ہے اس کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا، ارشاد ہوا: اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا (۲)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوۃ من الاسلام ج ا ص ۱۱-۱۲ (۲) بخاری کتاب العلم باب القراءۃ والعرض علی المحدث ج ا ص ۱۵۔

ایک اور مجلس میں صحابہؓ حاضرِ خدمت تھے، اور حضور ﷺ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا: تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں، اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں کہو! اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا: جو چاہو پوچھو، اس نے کہا: میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا: خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! اس نے کہا: میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ آئے ہیں، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں، میں ضمام بن ثعلبہ ہوں (۱)۔

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفتگی و جاں نثاری کا ایک اور واقعہ سنئے:

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور ﷺ کے ساتھ پیش آئے، صحابۂ کرامؓ جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت ﷺ کے جان نثار تھے، وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گذرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازبؓ ایک صحابی تھے، ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور ﷺ کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے (۲)۔

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوشِ عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدانِ جنگ ہے، آنحضرت ﷺ کی زندگی کا بڑا حصہ میدانِ جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہؓ نے جس جوش کے ساتھ آپ ﷺ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے

(۱) ایضاً بحوالہ سابق۔ (۲) ابوداؤد کتاب الحدود ج ۲ ص ۱۴۹ باب فی الرجل یزنی بحریمہ۔

آنحضرت ﷺ سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہؓ بن شعبہ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپ ﷺ کی ریشِ مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپ ﷺ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوشِ عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہؓ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ ﷺ کا لعابِ دہن بھی گرتا ہے تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپ ﷺ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے سبقت کرتا ہے، جب آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں، جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظر جاہ وجلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں، جس قدر محمد ﷺ کے اصحاب محمد ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپ ﷺ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے پیش دستی کرتا ہے، جب آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لئے لڑتا ہے، جب آپ ﷺ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ تعظیماً آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے (۱)۔

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپ ﷺ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انہوں نے کہا:

ایانا ترید یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا البحر لاخضناھا، ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الیٰ برک الغماد لفعلنا (۲)	یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے، اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد (۳) پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔

(۱) بخاری ج ۱ ص ۳۷۸-۳۷۹ کتاب الشروط باب الشروط فی الجهاد والمصالحة (۲) مسلم کتاب الجهاد باب غزوة بدر ج ۲ ص ۸۴ (۳) یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

غزوۂ احد میں جب آپ ﷺ نے کفار کی جمعیت کو ذرا گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابوطلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپ ﷺ کو روکا، اس سے زیادہ جوشِ محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے، انہوں نے کہا:

بابی انت وامی لاتشرف یصیبک سھم من سھام القوم نحری دون نحرک (۱)

میرے باپ ماں آپ پر قربان، آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھئے، کہیں آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔

خیر یہ تو صحابہؓ اور حضور انور ﷺ کے درمیان کے واقعات تھے، آنحضرت ﷺ کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا چنانچہ غیر قوموں کو عمالِ نبویؐ کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا، تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں، فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لئے آپ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو مقرر فرمایا، وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا یہ تو بہت ہے، انہوں نے کہا: اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں، تم لوگ اس کا نصف لے لینا، اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

ھٰذا الحق بہ تقوم السماء والارض قد رضینا أن ناخذہ بالذی قلت (۲)

انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان وزمین قائم ہیں، جو کچھ تم نے کہا ہم اس کو قبول کرنے پر راضی ہیں۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی، لیکن انہوں نے کہا: اے دشمنانِ خدا! تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو محبوب ترینِ خلائق ہے، اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں، لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل وانصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان وزمین اسی انصاف سے قائم ہیں (۳)۔

(۱) بخاری کتاب المغازی، غزوۃ احد ج ۲ ص ۵۸۱ (۲) ابوداؤد ج ۲ ص ۵۷ کتاب البیوع باب فی المساقاۃ

(۳) فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۳۱۔

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علاحدہ رکھا گیا ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، (۱) اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں، اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علاحدہ حدیں بنائی گئی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی، اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دین الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا، اور وہ اسلام ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۳-۱۹) (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے، اور کی جاسکتی ہے، ان ہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے، یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے، مگر سلطنت الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنت الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہِ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے، جل شانہ و تعالیٰ اسمہ، بادشاہی اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے، فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے، دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو، آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے،

(۱) انجیل۔

اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے، آپ کے احکام کی بجا آوری عین احکام خدا کی بجا آوری ہے:

وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء:۴-۸۰)	جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جو جانشین اور خلفاء ہوئے، ان میں بھی دین ودنیا کی یہی جامعیت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر وحاکم اور ان کی سلطنت کے فرماں روا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے، اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی، اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی (۱)	جس نے میرے امیر کا کہا مانا اس نے میرا کہا مانا، جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکام الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے، یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا، اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے، بشرطے کہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض ونیت سے ہے، خدا کے لئے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے سیاست وسلطنت سے متعلق جو کام بھی حسبِ حکمِ الٰہی کیا جائے، وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کی دادگری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسبِ احکامِ الٰہی اللہ کے لئے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجب قربت ہے، سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب وروز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یاد الٰہی میں مصروف رہیں، جب بھی وہ اللہ تعالیٰ

(۱) صحیح بخاری کتاب الاحکام ج ۲ ص ۱۰۵۷ وصحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء الخ ج ۲ ص ۱۱۵ مصر۔

کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض وواجبات وموکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں، حضرت داؤدعلیہ السلام کا جو قصہ سورہ ص میں ہے، جس میں چند داد خواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤدعلیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہوجانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بے ہودہ کہانی بنادیا ہے، حالاں کہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی دادگری اوران کے کاموں کی نگرانی ہے، اور یہی احساسِ فرض ہے جس پر حضرت داؤدعلیہ السلام کو متنبہ کیا گیا:

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ○ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ○ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

(ص:۳۸-۲۴تا۲۶)

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) ان کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی، اور رکوع میں گر گئے، اور رجوع کیا، تو ہم نے ان کو معاف کردیا، اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹادے گا۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط ونظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر اپنے عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کرکے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسبِ احکامِ الٰہی فرائضِ خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من امام يغلق بابه دون ذوى الحاجة والخلة والمسكنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته وحاجته ومسكنته(۱)

جو امام وحاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کرلے گا۔

---

(۱) جامع ترمذی ابواب الاحکام باب ماجاء فی امام الرعیۃ ج۱ ص۲۴۸۔

من ولی من امر المسلمین شیئا فاحتجب دون خلتهم وحاجتهم وفقرهم وفاقتهم احتجب الله عز وجل يوم القيامة دون خلته وفاقته وفقره(۱)

جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں کھڑی کی، اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لئے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں (۲) کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لئے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگایا، جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمدؓ بن مسلمہ کو اس لئے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا اور زاد راہ دینا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا، اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے (۳)۔

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکمِ نبوی سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا کہ جو اہلِ حاجت پہونچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کر دے (۴)۔

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائضِ حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں:

(۱) مستدرک حاکم کتاب الاحکام ج ۴ ص ۹۳ حیدر آباد۔ (۲) چوں کہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لئے اذن کا حکم ہے، اس لئے خود آنحضرت ﷺ نے اور خلفاء نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے، مگر عام پبلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔ (۳) مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۵۴۔ (۴) ترمذی ابواب الاحکام حوالہ مذکور۔

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○

(نساء:۴-۵۸،۵۹)

امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کردیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بے شک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے، مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں، ان کی بھی، اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے، اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، آیتِ پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلا درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے:

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ○ (رحمٰن:۵۵-۹)

اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو، اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اس معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لئے تولتے ہو اسی پیمانہ سے اپنے لئے بھی تولو:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ (مطففین:۸۳-۱تا۳)

پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلافِ انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

(مائدہ:۵-۴۲، حجرات:۴۹-۹)

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے:

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ○ (آل عمران:۳-۵۷و۱۴۰)	اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ○ (شوریٰ:۴۲-۴۰)	بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

"ظلم" کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے بہ حسن وخوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے، اور بہ حسن وخوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الٰہی کے تحت ادا ہوں:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (مائدہ:۵-۴۷)	اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

الا ایھا الناس لایقبل اللہ صلوۃ امام حکم بغیر ما انزل اللہ (مستدرک ج۴،ص۸۹ کتاب الاحکام)	ہاں اے لوگو! جو امام، خدا نے جو قانون اتارا ہے، اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔

سب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے، اور اس لئے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت بارگاہِ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت وفرماں روائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لئے آخرت میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے، اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں، ان کے لئے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لئے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

الامام الذی علی الناس راع ھو مسئول عن رعیتہ (صحیح بخاری ج۲،ص۱۰۵۷ کتاب الاحکام)	وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے، وہ نگراں کار ہے، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت وخلافت تاج وتخت کی بہار اور عیش وعشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے،

جو اس سے بہ سلامت گذر گیا، اس کے لئے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آسایش ہے، اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا، وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا:

ما من عبد یسترعیه الله رعیة فلم یحطها بنصیحة الا لم یجد رائحة الجنة	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔

(بخاری و مسلم حوالہ سابق)

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبیداللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے:

ما من عبد یسترعیه الله رعیة یموت یوم یموت وهو غاش لرعیته الا حرم الله علیه الجنة (مسلم کتاب الامارة باب فضیلة الامام العادل الخ ج ۲ ص ۱۱۱)	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمروؓ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے، عبیداللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں، اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں، اے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

ان شر الرعاء الحطمة (مسلم کتاب الامارة حوالہ مذکور ص ۱۱۲)	سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے۔

تو تو ان میں سے نہ بن، اس نے کہا: آپ محمد ﷺ کے اصحاب میں بھوسی ہیں، فوراً بولے: کیا حضور ﷺ کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، نبوت مجھ پر ختم ہوگئی، البتہ خلفاء

ہوں گے، اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی، صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تو ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا: پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو، (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو):

فان اللہ سائلھم عما استرعاھم (صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب ما ذکر عن بنی اسرائیل ج ۱ ص ۴۹۱)

کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق بازپرس فرمائے گا، جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے امرا کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

اللّٰھم من ولی من امر امتی شیئا فشق علیھم فاشقق علیہ ومن ولی من امر امتی شیئا فرفق بھم فارفق بہ (مسلم کتاب الامارۃ باب فضیلۃ الامام العادل ج ۲ ص ۱۱۰)

اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا، اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں باشاہ سے لے کر ادنا افسر تک شامل ہیں، اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے، ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ فالامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہ والرجل راع علی اھل بیتہ وھو مسئول عن رعیتہ والمرأۃ راعیۃ علی اھل بیت زوجھا وولدہ وھی مسئولۃ عنھم و عبدالرجل راع علی مال سیدہ وھو مسئول عنہ، الا فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ (صحیح بخاری کتاب الاحکام باب قول اللہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ الخ ج ۲ ص ۱۰۵۷)

ہاں! تم سب نگرانِ کار ہو، اور تم سب سے اپنے زیرِ نگرانی اشخاص ورعایا کی بابت پوچھ ہوگی، تو لوگوں کا امیر نگرانِ کار ہے اس کے زیرِ نگراں کے متعلق پرسش ہوگی، اور مرد اپنے گھر والوں کا نگرانِ کار ہے، اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی، اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگراں ہے، اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے، اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا، تو ہاں! ہشیار رہو، تم سب نگرانِ کار ہو، اور تم سے اس کے زیرِ نگراں کے بابت بازپرس کی جائے گی۔

لفظ رعیت اس موقع پر ایک مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر

رائج ہے، اور وہ رعیت ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں، یہ الفاظ لفظ ''رعی'' سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا اور رعیت وہ ہے جس کو وہ چرائے، اور جس کی وہ نگہ بانی کرے، اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو در حقیقت ایک امیر کی حیثیت، ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سر سبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے، اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے، اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور ﷺ کی زبان مبارک پر لفظ ''رعیت'' کس قدر شفقت آمیز اور پر محبت معنوں میں آیا ہے، اور ظالم و سفاک امرا اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں، حالاں کہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بہ خوبی عہدہ برآ ہوں گے، رسول اللہ ﷺ نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

ان المقسطين عند الله على منابر من نور عن يمين الرحمٰن عز و جل و كلتا يديه يمين الذين يعدلون في حكمهم واهليهم وما ولوا (صحیح مسلم كتاب الامارة باب فضيلة الامام العادل ج۲ص۱۱۰)

بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امرا) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیرِ حکومت امور میں عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے، جامع ترمذی میں ہے:

ان احب الناس الى الله يوم القيامة وادناهم منه مجلسا امام عادل وابغض الناس الى الله وابعدهم منه مجلسا امام جائر (ترمذی ابواب الاحكام باب ماجاء في الامام العادل ج۱ص۲۴۸)

بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امامِ عادل ہوگا، اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دور وہ امام ہوگا، جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم وامیر عدل وانصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، فرمایا:

ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لایجھدلھم وینصح الا لم یدخل معھم الجنۃ (صحیح مسلم کتاب الامارۃ ج۲ص۱۱۲)

جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو، پھر وہ ان کے لئے محنت نہیں کرتا، اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔

مامن وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللہ علیہ الجنۃ (صحیح بخاری کتاب الاحکام باب من استرعیٰ رعیۃ فلم ینصح ج۲ص۱۰۵۹)

کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیرِ نگرانی جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت حرام ہے۔

انما الامام جنۃ یقاتل من وراءہ ویتقیٰ بہ فان امر بتقویٰ اللہ وعدل فان لہ بذلک اجرا وان امر بغیرہ فان علیہ وزرا (نسائی کتاب البیعۃ ذکر ما یجب للامام ج۲ص۱۶۵)

امام ڈھال ہے، اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا، اور اگر غیرِ تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لئے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت وریاست اور سلطنت وولایت بھی امورِ دین کا درجہ رکھتی ہیں، اور وہ بھی ثواب وعذاب اور جزا وسزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور واعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت، یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال وعبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیوں کہ یہاں دین کے معنی احکامِ الٰہی ہیں، یا قوانینِ الٰہی ہیں، یہ احکامِ الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت وولایت اور حکومت وریاست کے کاروبار کا نظم ونسق اور اہتمام وانصرام بھی دین ہی کا ایک جز ہے۔

ایک مدت سے علما کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیامِ سلطنت اور امورِ سلطنت میں دخل وتدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہل علم اور اہل اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہئے، حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے (۱) گوشہ نشینی تو حافظا مخروش　　　رموز مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور وغل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز واسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجرا کے لئے ہے، اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال وجہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے، اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضرات خلفائے راشدین اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکام الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجرا ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضبِ الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدانِ جہاد کے صبر وثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ○ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ (انفال: ۸-۱۵،۱۶)

اے اہلِ ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا، اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لئے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے، ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا، اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (بقرہ: ۲-۱۷۷)

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں، اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ جہاد وقتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامتِ دین، تنفیذِ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت وخلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے، عام عبادات واعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس

(۱) حافظ علیہ الرحمۃ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار ومصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہئے، جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز ومصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الٰہی کے رموز واسرار کی تلاش وطلب نہیں کرنی چاہئے۔

تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی راہ میں خونِ شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے:

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِاللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ (آل عمران:۳-۱۹۵)

تو جو لوگ میرے لئے وطن چھوڑ گئے، اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور ستائے گئے، اور لڑے اور قتل کئے گئے، میں ان کے گناہ دور کر دوں گا، اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورہ نور میں ہے:

وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (نور:۲۴-۲)

اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آوے۔

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکام الٰہی کی تنفیذ و اجرا سے ہے، اسی طرح سورہ بقرہ کی اس آیت میں:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (بقرہ:۲-۱۹۳)

اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

صرف حکم الٰہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے، سورہ انفال کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال:۸-۳۹)

اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے، اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم و قانون الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے، اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام:۶-۵۷، یوسف:۱۲-۴۰) اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (انعام:۶-۶۲) ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (نحل:۱۶-۵۲)

اور اسی خدا کا ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظم قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت وملکیت کی حقیقت: اب دین کی تشریح کے بعد حکومت وسلطنت وولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت وسلطنت کو عیش وتنعم کے ایوان زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال وجبروت اور قہر وہیبت کی تلواروں کے سایے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے، اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کردیئے: سلطنت وحکومت اور ولایت وریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیمِ محمدی ﷺ نے ان سب لفظوں سے جو جبر وقہر اور ظلم اور ستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لئے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ○ مَلِكِ النَّاسِ ○ اِلٰهِ النَّاسِ ○ (الناس:۱۱۴-۱تا۳)	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی۔
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ (حشر:۵۹-۲۳)	بادشاہِ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن وامان والا۔
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (مومنون:۲۳-۱۱۶)	تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔
اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ (جمعہ:۶۲-۱)	بادشاہِ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا۔

یہ آیت قرآن پاک میں چھ جگہ آئی ہے، اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو "الملک الحق" یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس "لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس "لوگوں کا

پالن ہار" بھی کہہ دیا گیا ہے تا کہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا تا کہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے، تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفتیں آئی ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم وسفا کی، قہر و جبر اور بے رحمی وسخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضرور لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت: عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا، اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے، اسلام میں شاہِ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا:

اخنع الاسماء عند اللہ رجل تسمّی ملک الاملاک (صحیح بخاری کتاب الادب باب ابغض الاسماء ج ۲ ص ۹۱۶)	سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرزِ حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرماں روا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائم مقام ہے؟

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں، توراۃ میں یہ بیان صرف حضرت آدم علیہ السلام کے آغازِ پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت

کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام ومرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض، احکامِ الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے، پہلی چیز اسلام کے اساسی عقاید ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں (۱)۔

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ:۲-۳۰)	اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام تھے، جو تمام بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اس لئے دوسرے موقعوں پر آدم علیہ السلام کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ○ (بنی اسرائیل:۱۷-۷۰)	ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں، اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف وامتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قائم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

اِھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ○ (بقرہ:۲-۳۸)	تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ رہنمائی آئے تو جو میری رہنمائی کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورۂ اعراف میں ارشادِ الٰہی ہے:

---

(۱) خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیتِ استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○
(اعراف:۷-۱۰،۱۱)

اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو، اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی اس لئے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (انعام:۶-۱۶۶)

اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا تا کہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے، بے شک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے، اور وہ بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا جانشین، فرمایا:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ
(اعراف:۷-۶۹)

اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوحؑ کے بعد جانشینی بخشی۔

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ
(اعراف:۷-۷۴)

اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔

حضرت ہودؑ اپنی قومِ عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری نہ کی:

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (ہود:۱۱-۵۷)

تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضور انور ﷺ کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہے:

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ○ (انعام:۶-۱۳۴)

اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائے گا، اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور:۲۴-۵۵)

اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا، جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام:۶-۱۶۵)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے جانشین بنائے۔

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ○ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ○ (یونس:۱۰-۱۳،۱۴)

اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو، جب انہوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں، اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، ہم گنہ گار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ (یونس:۱۰-۷۳)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوح) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے، سب کو (طوفان سے) بچالیا، اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنادیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ (فاطر:۳۵-۳۹)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے۔

حضرت داودؑ کو خلافت بخشی گئی:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص:۳۸-۲۶)	اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خَلَف سے مشتق ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لئے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیوبت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے بہ ظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمایندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے، قرآن پاک میں ہے:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

(اعراف:۷-۱۶۹ اور مریم:۱۹-۵۹)

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا:

اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ (اعراف:۷-۱۴۲)	میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے:

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ (زخرف:۴۳-۶۰)	اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا، جو تمہارے جانشین ہوتے۔ بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه واما لتشريف	خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں، اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو، یا اس کی موت کے

المستخلف . (ص ۱۵۵ مصر) سبب سے ہو، یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لئے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں، اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زادہ صاحبِ روح المعانی تک ہر آیت پر جس لفظ میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنوں کے لئے مختلف قول نقل کئے ہیں، اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کردے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا، اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اسی کی جانشینی مراد ہوگی، اور جہاں تصریح نہیں ہے، وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ — اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔ (حدید: ۵۷-۷)

اب اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لئے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے، اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے، کہ وہ اس کی طرف سے امورِ خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے، کشاف میں ہے(۱):

ان الاموال التی فی ایدیکم انما هی اموال الله بخلقه وانشاءه لها وانما موّلکم اياها وخوّلکم للاستمتاع بها، وجعلکم خلفآء فی التصرف فيها — وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے، (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیوں کہ اسی نے اس کو بنایا ہے، اسی نے تمہارے تمتع کے لئے اس کا تم کو مالک بنایا ہے، اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔

(۱) تفسیر سورہ حدید ج ۲ ص ۱۴۴۸ مطبوعہ ۱۲۷۶ھ۔

بیضاوی میں ہے:

من الاموال التی جعلکم اللہ خلفآء فی التصرف فیہا(۱)

وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

روح المعانی میں ہے:

جعلکم سبحانہٗ خلفاء عنہ عزوجل فی التصرف فیہ من غیر ان تملکوہ حقیقۃً (۲)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا، اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے، نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل ونائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب کا سرِ عنوان ہے، یعنی:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ:۲-۳۰)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرمارہا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

انی جاعل فی الارض خلیفۃ منی یخلفنی فی الحکم بین خلقی

میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں۔

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

ان اللہ تعالٰی اخبر الملٰئکۃ انہ جاعل فی الارض خلیفۃ لہ یحکم فیھا بین خلقہ بحکمہٖ (تفسیر طبری ج۱ص۱۵۴مطبوعہ مصر)

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے، کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے، جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان

اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیوں کہ وہ اس کی زمین

(۱) تفسیر بیضاوی ج۲ص۳۴۷ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۲۸۲ھ۔ (۲) روح المعانی ج۲۷ص۱۴۶ مطبوعہ مطبعہ منیریہ مصر۔

خلیفۃ اللہ تعالیٰ فی ارضہ وکذلک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض وسیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم وتنفیذ امرہ فیھم لا لحاجۃ بہ تعالیٰ الیٰ من ینوبہ بل لقصور المستخلف علیہ عن قبول فیضہ وتلقی امرہ بغیر وسط(۱)

میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گذری ہیں، اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفا فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافت الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے، اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

۱-تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲-روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، اس لحاظ سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے، اور جس اہمیت سے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان کی عدول حکمی، اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلۂ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات وفضائل جو بیان کئے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی تھی۔

۳-اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے، اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق وسباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی، اور اگر اس توضیح سے کلام کلیتہً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح

(۱) تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۴۴۔

ہے، جس کا آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہہ خود اپنا نائب بنانا متعین ہو جائے گا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں، جن سے آدم اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل: ۱۷-۷۰)

ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں، اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (تین: ۹۵-۴)

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے، سب اس کے لئے بنا ہے، اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (جاثیہ: ۴۵-۱۳)

اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں، اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں، جو سوچتے ہیں۔

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن پاک میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقاتِ الٰہی کو انسان کا تابع دار اور مسخر اور اسی کے لئے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لئے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ: ۲-۲۹)
اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ (نحل: ۱۶-۱۴)
اور وہی تو ہے، جس نے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ (جاثیہ: ۴۵-۱۲)
اللہ ہی تو ہے، جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ (ابراہیم: ۱۴-۳۲)
اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیرِ فرمان کر دیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (ابراہیم: ۱۴-۳۲)
اور نہروں کو بھی تمہارے زیرِ فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصودِ اصلی ہے، اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے، اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ○ (احزاب:۳۳-۷۲)	ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت ونیابتِ الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے، یہ امانتِ الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت وخلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے، جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے، اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات ومحاسن واوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں، اور اسی کے خزانے سے اس کو چندروز کے لئے عاریت ملے ہیں، یہ حدیث کہ فان الله خلق اٰدم علىٰ صورته (۱) (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے، اور مشہور قول تخلقوا باخلاق الله (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریۂ سلطنت وریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے، اور جس کے اند مادی وروحانی سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست وگریباں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے: وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ ○ (ذاریات:۵۱-۵۶) (میں نے انسان اور جن کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے، جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعتِ الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب النهى عن ضرب الوجه ج۲ص۳۹۷۔

امت مسلمہ کی بعثت

عقیدۂ خلافت کے رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابت الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمایندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جب کہ محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے لئے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں، اور آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امتِ محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابتِ الٰہی کی نمایندہ ہے، اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمایندہ رہے گی، اسی لئے قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی پچھلوں کے ہیں:

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ○ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ○ (واقعہ: ۵۶-۳۹، ۴۰)

ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔

وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ (جمعہ: ۶۲-۳)

اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی، کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ انبیاء کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا کام بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنچا

دیا، اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا وحاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے، (کنز العمال ج ۶ ص ۲۳۰ دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۱۴ھ ہجری)

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امت مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح بخاری (۱) و مسلم و نسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے:

نحن الأخرون السابقون — ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں، لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن، ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم، بیہقی اور نسائی میں بھی ہے۔ (کنز ج ۶ ص ۲۳۰)

ابن ماجہ میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نحن اٰخر الامم (کنز ج ۶ ۔ص ۲۳۰) — ہم سب سے آخری امت ہیں۔

غرض ان آیات و احادیث سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ امتِ محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے، کیوں کہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چوں کہ آخری امت ہے، اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے، اس لئے قیامت تک اس میں اہلِ حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا، اور اہلِ عذر کی حجت کا قاطع ہوگا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا، اب ظاہر ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کردے گا، گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے، مگر عالمِ تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لئے اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا، اس کے بعد پورا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، تو وہ بھی اسباب و تدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہوگا، اسی لئے

(۱) صحیح بخاری کتاب التعبیر باب النفخ فی المنام ج ۲ ص ۱۰۴۲۔

قرآن پاک کی بقائے دوام کے لئے حاملینِ قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا اور ان ہی کے ہاتھوں اور ان ہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (اعراف:۷-۱۸۱)	ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے، جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے، (اور کرتی رہے گی)۔

اہلِ تفسیر نے اس کو امت محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے، اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لئے ہے، یعنی قیامت تک امت محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا۔(۱)

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (آل عمران:۳-۵۵)	اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں، اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں، (۲) مگر ایک معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جاسکتے ہیں، گو گمراہ ہوں (۳)، بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہلِ اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں، اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبۂ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ نزول مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات النص کی تصریح احادیثِ نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے:

لا یزال من امتی امة قائمة بامر اللہ لایضرھم من خذلھم ولامن خالفھم حتی یاتیھم امر اللہ وھم علیٰ ذٰلک (بخاری علامات النبوۃ ج۱ص۵۱۴)	میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آجائے گی، اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔

(۱) تفسیر بغوی ص ۳۶۷ مطبوعہ ۱۲۸۵ھ و تفسیر خازن تفسیر آیت مذکورہ ج ۲ ص ۲۶۳ مطبعۃ التقدم مصر ۱۳۳۱ھ۔
(۲) تفسیر ابن جریر، تفسیر آیت مذکورہ ج ۳ ص ۱۸۵-۱۸۶ مطبعہ میمنیہ مصر۔ (۳) تفسیر روح المعانی، تفسیر آیت مذکورہ ج ۳ ص ۱۶۲ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر۔

لایزال الناس من امتی ظاھرین حتی یاتیھم امر اللہ وھم ظاھرون (بخاری علامات النبوۃ ج ۱ص ۵۱۴)

میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ خدا کی بات یعنی قیامت آجائے گی۔

لا یزال من امتی قوم ظاھرین علیٰ الناس حتی یاتیھم امر اللہ (بخاری کتاب التوحید ج ۲ص ۱۱۱۱)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

لاتزال من امتی امة قائمة بامر اللہ ما یضرھم من کذبھم ولا من خذلھم حتی یاتی امر اللہ وھم علیٰ ذلک (بخاری کتاب التوحید ج ۲ص ۱۱۱۱)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہے گا، اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

لاتزال طائفة من امتی ظاھرین علیٰ الحق لایضرھم من خذلھم حتی یاتیھم امر اللہ وھم کذلک

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

(مسلم کی تمام روایتیں مسلم کتاب الامارۃ باب قولهٗ ﷺ لاتزال طائفة الخ ج ۲ص ۱۴۳-۱۴۴ سے ماخوذ ہیں)

لن یبرح ھذا الدین قائمًا یقاتل علیه عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعة

(مسلم کتاب الامارۃ ج ۲ص ۱۴۳)

یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا، اس کے لئے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

لاتزال طائفة من امتی یقاتلون علیٰ الحق ظاھرین الیٰ یوم القیامة (مسلم کتاب الامارۃ ص ۱۴۳)

میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔

لاتزال طائفة من امتی قائمة بامر اللہ لا یضرھم من خذلھم او خالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم ظاھرون علیٰ الناس

(مسلم کتاب الامارۃ ص ۱۴۳)

میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکامِ الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے، ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی، اور وہ غالب رہیں گے۔

ولاتزال عصابة من المسلمین یقاتلون علیٰ الحق ظاھرین علیٰ من ناواھم الیٰ یوم القیامة (مسلم کتاب الامارۃ ص ۱۴۳)

مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی، اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔

لاتزال عصابة من امتی یقاتلون علیٰ امر اللہ قاھرین لعدوھم لایضرھم من خالفھم حتی تاتیھم الساعة وھم علیٰ ذٰلک (مسلم کتاب الامارۃ ص۱۴۴)	میری امت کی ایک جماعت خدا کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی رہے گی، اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں، (۱) اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے ہماری تسکینِ خاطر کے لئے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گا، تا کہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی، اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ادا ہوتا تھا، وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی، ایک حدیث ہے العلماء ورثة الانبیاء (۲) یعنی امت محمدی کے علما انبیا کے وارث ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں نہیں ہے، کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات اقدس پر ختم ہوگیا بلکہ نبوت کے فضائل و کمالات و فرائض سے ان کے حسبِ استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا، اور وہ تبلیغِ دین، ہدایتِ خلق، دعوتِ حق، اقامتِ دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفعِ شبہات، ابطال مبطلین اور ردِ بدعات وغیرہ ہیں، اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور ﷺ کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی تو یہ امتیں بہ یک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی:

کادت ھذہ الامة ان تکون انبیاء کلھا (۳)	قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں۔

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے، کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء

(۱) دیکھئے کنز العمال ج۶ ص۲۳۱ و ۲۳۵۔ (۲) یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعددہ مروی ہے، اور محدثین نے اسی لئے اس کو معتبر مانا ہے، دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی ص۱۳۵ مطبع علوی ۱۳۰۴ھ و کشف الخفاء عجلونی ج۲ ص۶۴ مکتبہ القدسی ۱۳۵۱ھ۔ (۳) مسند ابی داؤد الطیالسی ج۱۱ ص۳۵۴ عن ابن عباسؓ و مسند احمد و ابو یعلی۔

علی الامۃ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوات اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا، (۱)، یہ شاید اس لئے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے، حضرت عبادہؓ بن صامت سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے، ''اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ	مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا مجھ سے مانگو، میں
(غافر: ۴۰-۶۰)	دعا قبول کروں گا۔

حالاں کہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا، اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ	اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔
(حج: ۲۲-۷۸)	

اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا، اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ	ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا، تا کہ تم
عَلَى النَّاسِ (بقرہ: ۲-۱۴۳)	لوگوں پر شاہد ہو۔

یہ بھی صرف پہلے نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو''۔ (۲)

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے موید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے، کہ امت محمدیہ کو شہادت علی الناس اور شہادت علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

''شہید'' اور ''شاہد'' کے لغوی معنی ''حاضر'' کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہوسکتا ہے، مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لئے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لئے، اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے، اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس

(۱) حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کی تفسیر میں ان روایتوں کو یک جا کر دیا ہے۔ ج ۱ ص ۱۹۰-۱۹۱ مطبع مصطفیٰ محمد ۱۹۳۷ء۔ (۲) تفسیر فتح البیان میں نواب صدیق حسن خان نے اس روایت کا کچھ حصہ نقل کیا ہے، دیکھئے ج ۱ ص ۱۹۴ ''ع''۔

کے دعویٰ کی تائید کے لئے، اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لئے، اسی لئے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان ثانوی معنوں میں حسب سیاق وسباق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا:

۱۔ حمایتی اور مددگار کے معنی میں:

وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بقرہ:۲-۲۳)　　اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ (کہ قرآن کا جواب لائیں)

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ (بنی اسرائیل:۱۷-۸۸)　　اگر چہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

۲۔ ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدٌ (حج:۲۲-۱۷)　　اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

اس معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں:

۳۔ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (مائدہ:۵-۱۱۷)　　(حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک ان میں رہا، نگراں رہا۔

۴۔ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ○ (نساء:۴-۴۱)　　بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے، اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔

۵۔ امور خیر کی تعلیم، یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ○ (بقرہ:۲-۱۴۳)　　اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا، تا کہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو، اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(آل عمران:۳-۱۱۰)

قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے، وہ ہر نبی کے دعویٰ کی شاہد حمایتی، مددگار اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگرانِ کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا، کہ دین الٰہی کامل ہو چکا، پیغامِ الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امتِ محمدیہؐ کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظام عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے، رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام وپیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا وامام ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاءؑ کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام بلائے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے ہاں! میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے، کہ میرے پاس تو کوئی ڈرسنانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام سے پوچھے گا، تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت، تو یہ نوح علیہ السلام کی شہادت دیں گے، یہ ارشاد فرما کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا الخ'' (یعنی تم کو معتدل وعادل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو، اور رسول تم پر گواہ ہو) (صحیح بخاری تفسیر سورہ بقرہ ج ۲ ص ۶۴۵)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد ومستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امتِ محمدیہؐ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت

ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ یہ ان کے ایمان کا جز ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورۂ حج میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (حج:۲۲-۷۸)	اسی اللہ نے تم کو (اے امت محمدیہؐ) (ساری امتوں) میں چنا ہے، اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین، اسی نے تمہارا نام مسلم پہلے رکھا، اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہؐ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَّسَطًا (عادل ومعتدل امت) خَيْرَ اُمَّةٍ (سب سے بہتر امت) هُوَ اجْتَبٰكُمْ (تم کو خدا نے چنا ہے) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی، برتری اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ وصف اجتبا کم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امتِ محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو قیامت تک کے لئے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں وہ نبی ﷺ کی امتِ دعوت ہیں، حضور انور ﷺ نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا، آپ ﷺ کے بعد عہد بہ عہد قیامت تک اس پیغامِ الٰہی کی دعوت وتبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد ہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغامِ الٰہی کی دعوت وتبلیغ تابہ قیامت امتِ محمدیہؐ کا فریضہ ہے، یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امت محمدیہؐ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حسب ذیل فرمائی ہے:

”تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی

سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے، تو اس نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی بعثتِ ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے''(۱)۔

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے، اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے، اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثت اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (جمعہ:۶۲-۲) وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی کے اندر سے بھیجا۔

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۳-۱۱۰) قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو۔

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (۲) تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے، اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے، اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع میں اخیر حکم:

فلیبلغ الشاهد الغائب (۳) میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ باب حقیقۃ النبوۃ وخواصھا ج اص ۶۷ مطبعہ خیریہ ۱۳۲۲ ہجری۔ (۲) حجۃ اللہ البالغہ ج اص ۶۷۔

(۳) بخاری کتاب العلم ج اص ۲۱، اور مسلم وغیرہ۔

صرف حضور انور ﷺ کے عہد مبارک تک کے لئے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لئے یہ جاری وساری ہے، فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے، ذیل کی آیتِ پاک کا بھی یہی منشا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۝ (توبہ:۹-۱۲۲)

تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تا کہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈرساتے، تا کہ وہ حذر کرتے۔

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی۔

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گذر چکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران:۳-۱۱۰)

قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ اس امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لئے سرفروشی کرے، اور اسی لئے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ (آل عمران:۳-۱۰۴)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت وتبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کے آغوش میں اپنا نیا خون لے کر آئیں، اور اسلام کی صولت وشوکت کو مسلسل قیام وبقا بخشتی رہیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہوگئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا، مگر انشاء اللہ یہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر

رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی:

اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ وَّيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ وَلَا تَضُرُّوۡهُ شَيۡـئًا (توبہ:۹-۳۹)

اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا، (جو خدا کے پورے فرماں بردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔

پھر فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡـنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ يُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَاۤـئِمٍ‌ؕ ذٰ لِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ (مائدہ:۵-۵۴)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہارِ حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۞ وَجَاهِدُوۡا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ‌ ؕ هُوَ اجۡتَبٰٮكُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ‌ ؕ مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ‌ ؕ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ‌ ‌ۖ فَاَقِيۡمُوا

مومنو! رکوع کرتے رہو اور سجدہ کرتے رہو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو، تا کہ فلاح پاؤ اور خدا کی (راہ) میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے، اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی، (اور تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی

الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ هُوَ مَوْلٰکُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ○

(حج:۲۲-۷۷-۷۸)

(وہی نام رکھا ہے) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں، اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو، اور نماز پڑھو اور زکوۃ دو اور خدا کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمہارا دوست ہے، اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔

ان آیتوں سے اس شاہدِ امم اور مجتبائے عالم امت کے حسبِ ذیل آثار و علامات ہیں:

۱۔ ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی۔

۲۔ ادائے زکوۃ پر عامل۔

۳۔ ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط۔

۴۔ رکوع و سجود و عبادتِ الٰہی کی خوگر۔

۵۔ امورِ خیر پر حریص۔

۶۔ راہِ حق میں جہاد اور فدا کاری پر آمادہ رہنے والی۔

امتِ محمدیہؐ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا، جو اس کی بقا اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

کسی جماعت کو منظم بنانے اور اس کی حفاظت کے لئے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لئے ایک قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ کی ضرورت فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے، اسی لئے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو، انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا، اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی، تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گذاری کا صلہ سمجھنے کے بجائے اپنے غرور واستکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا یا مافوق بشر قویٰ سے اپنے کو متصف قرار دیا، اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا، جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی، ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی، یعنی کوئی سورج دیوتا کا نورِ نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے، اور مصر کے فرعون اپنے کو رَعْ یعنی سورج دیوتا کا اوتار کہتے تھے، ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا) بننے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اسی لئے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغپور (خدا کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا، یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو خدا کا اوتار کہتے تھے، ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے، (۱) اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے، یعنی جاپان میں یہ اندھیر اچھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا خدا ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون یونان۔

روما کا بانی رولس اور اس کا بھائی دونوں ستارۂ مریخ کی اولاد تھے(۱) ولادت مسیحؑ کے پہلے سے سلاطینِ روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے، اوران کی پرستش کی جاتی تھی، (۲) یہودیوں میں حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو خدا کے کاہن اور خدا سے الہام پاکر خدا کے نام پر حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں، ان ہی سب کے پیشِ نظر اربابِ تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں، مثلاً اوتاری، شخصی، زعیمی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

۱-اوتاری سے مفہوم تھیا کریسی ہے، یعنی وہ حکومت جس میں صاحبِ حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود خدا یا خدا کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

۲-شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت واثر سے حکومت کرتا ہو، اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گذرے ہیں۔

۳- اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے، جیسی کبھی یونان میں تھی۔

۴-اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضعِ قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۵-زعیمی (آمرانہ) وہ طرزِ حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمایندہ کی حیثیت سے ملک پر حکمراں ہوتا ہے، مثلاً جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمایندہ تھے۔

۶-اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لئے ایک مدت متعینہ کے لئے اپنا کوئی رئیس منتخب کرلیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت

(۱) تاریخ روما ص ۳ دارالترجمہ حیدرآباد دکن۔ (۲) ایضاً ص ۴۲۹۔

وہ ہے جو فرانس میں ہے، اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی اصل ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیراعظم پر ہوتی ہے، اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے، اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سکریٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے، جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کے نمایندوں پر مشتمل ہے۔

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لئے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کئے ہیں۔

اسلام کے طرزِ حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے، اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسین یورپ نے اسلامی خلافت کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا، پرانے علماء جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں، اس کو شخصی بتاتے ہیں، نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا، پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے (اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی، اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) قوت پکڑ رہی ہے تو اس کو زعیمی حکومت ثابت کرنے کے لئے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں، ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بہ یک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری اور زعیمی حکومتوں کے خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لئے اہلِ نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا، اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے، وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات وفضائل تو یک جا ہیں لیکن وہ ان کے قبائح ومثالب سے خالی ہے، اس لئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی، کبھی زعیمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری

بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط وخال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے، نہ خدا کا اوتار ہے نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہِ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لئے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جاسکتا ہے، اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں اربابِ شوریٰ اور اہلِ حل وعقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے، اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افرادِ امت کی جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکامِ شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے، اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے، اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صواب دید پر بے چون وچرا عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہے، اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جاسکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات حکومت میں سے کوئی ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی، اور اسلام کی نظر اس کے اندر کے حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، اربابِ شوریٰ کی ترتیب اور تعیین، ان کے فرائض وحقوق، ان کے انتخاب، اظہارِ رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر ورئیس اور اس کے ارکان وعمال کا تقویٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی وایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جز کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے، اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے، اور خدا کے بنائے ہوئے اور تعلیم کئے ہوئے احکام وفرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے، اور سب ہی ایک جیسے اس کے

بندے اور تابعِ فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین وحکام اور سلطنت کے عمال کے قول وفعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہیں کہ وہ حق وعدل کے خلاف نہ کرسکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے، تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کرسکیں۔ عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لئے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں، اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصولِ اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈران کے دل کی ہر کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کردیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہدِ نبوت، زمانۂ خلافت اور بعض نیک وعادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عملِ صالح کی دعوت وتبلیغ برابر جاری رہے اور مسلسل تعلیم وتربیت اور تبلیغ ودعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم وباقی رکھا جائے۔ جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ یا سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم وتربیت اور تبلیغ و دعوت دی جاری ہے، اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم وتربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے، اسی طرح اس اسلامی نظامِ حکومت کی برقراری کے لئے بھی سب سے پہلے اسلامی نظامِ تعلیم وتربیت کے اجراء کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام:۶-۵۷، یوسف:۱۲-۴۰و۶۷)

(حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔)

آیتِ بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں مگر اللہ کا ہے اس لئے اسلام میں حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں، اور دوسرے تکوینی یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری وساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنھوں نے نمرود وفرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہہ ان سلاطینِ عالم کو اس لئے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام وفرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک وشبہہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی، زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے، اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ، فیصلہ ہے، اس معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ. (انعام:۶-۵۷، یوسف:۱۲-۴۰و۶۷)	حکم نہیں، مگر اللہ کا۔
اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ○ (انعام:۶-۶۲)	ہاں اسی کے لئے حکم کرنا ہے، اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔
لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (قصص:۲۸-۷۰)	اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

امرِ تکوینی وفطری میں تو انسان کی ناچاری ومجبوری ظاہر ہے، وہ زمین، آسمان اور خاک وباد

وآب وآتش اور جسم وجان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں کرسکتا، نہ اشیا کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے اور نہ ان کے قواعد وقوانین میں ایک ذرہ کی کمی واضافہ کرسکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سبھی سرافگندہ اور ناچار ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کردیا، فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ. (بقرہ:۲-۲۵۸)

تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہوگیا۔

حکومت وسلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ (آل عمران:۳-۲۶)

اے اللہ سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے۔

اس لئے راہِ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکامِ تکوینی کی طرح اس کے احکامِ تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں، اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لئے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں، اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجرا اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرمادیے ہیں، ان کے تتبع سے اہلِ علم اور مجتہدینِ دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کرسکتے ہیں۔

ان احکامِ الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع وضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہہ اہلِ عقل اپنی عقل وفہم سے فیصلہ کرسکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدمِ رضا شامل ہے، یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب مترتب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہوسکتا ہے، اہلِ عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ حکمِ الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں، مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لئے امرِ غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے، اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے، اس لئے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو

خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورۂ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر ونہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہا نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ. حکم صرف اللہ کے لئے ہے۔

(انعام:۶-۵۷، یوسف:۱۲-۴۰و۶۷)

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف:۷-۵۴) ہاں اسی اللہ کے لئے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادثِ عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورہ انعام اور سورہ یوسف میں، سورہ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے:

مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ○ (انعام:۶-۵۷)

جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے، اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ سورہ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں، کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے مگر ہوگا وہی جو اللہ چاہتا ہے:

وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (یوسف:۱۲-۶۷)

اور خدا کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے، (باوجود اس تدبیر ظاہری کے) دل سے اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ يُغْشِی الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا

وَالۡاَمۡرُ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ○ (اعراف:۷-۵۴)

کیا، ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یادرکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق وتکوین سے ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امورِ تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر صرف اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

لَا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ (مریم:۱۹-۴۴) شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

اَنۡ لَّا تَعۡبُدُ وا الشَّیۡطٰنَ (یٰسین:۳۶-۶۰) یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیا اور ائمہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکامِ الٰہی کی تبلیغ، اجرا اور تنفیذ کے لئے حکم الٰہی کے تحت ہے، ارشاد الٰہی ہے:

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (نساء:۴-۵۹) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولوالامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علما ہوں یا حکام، خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجرا میں ہے، اور رسول کی اطاعت بھی احکامِ الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ (نساء:۴-۸۰) اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (نساء:۴-۶۴)

اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا، اور ان کا حکم حکمِ خدا سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا مجرم قرار دیا ہے، اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (توبہ:۹-۲۹)

اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے ہیں، اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا (توبہ:۹-۳۱)

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے، اور مریم کے بیٹے مسیح کو، حالاں کہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیوں کہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہلِ کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران:۳-۶۴)

اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں، اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، اور نہ ہم ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتمؓ جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورہ توبہ والی آیت مذکور پڑھی تو عدی نے کہا ''وہ ان کو معبود نہیں بناتے'' فرمایا کیوں نہیں، انہوں نے ان کے لئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں، فذٰلک عبادتھم ایاھم (۱) ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے، اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے (۲)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ خدا کا ہے، اور اسی کا نام وضعِ حکم ہے، اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکمِ خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانونِ الٰہی کی سختی سے بچنے کے لئے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لئے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے، زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا، چنانچہ بعض اصولی احکام عدل و انصاف اور طریق اطاعت احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (نساء:۶۰)	کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا، ایمان لا چکے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں، حالاں کہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں، جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے، ''کل معبود من دون اللہ'' اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں، جادوگروں، اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لئے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

(۱) تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۴۸۔ (۲) ترمذی تفسیر آیت توبہ ج ۲ ص ۱۴۰۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے، اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ:۵-۴۷)

اور اللہ نے جو اتارا ہے، اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے، حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے، اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں، اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے، قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکامِ الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (بقرہ:۲-۱۸۷، ۲۲۹ و نساء:۴-۱۳)

یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (طلاق:۶۵-۱)

یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں، جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورہ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

(نساء:۴-۱۳، ۱۴)

یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے، او رجو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لئے بڑی ذلت کی سزا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ ورسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے، اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے، اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔

قانون وشرع کی حقیقت تحلیل وتحریم ہی ہے، اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کر لے اور بلا سندِ الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کر لے تو

اس کا نام "افتراء علی اللہ" خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْکَذِبَ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ○ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ (نحل:۱۶-۱۱۶)

اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے حلال و حرام بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تا کہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، ایسا جو لوگ کرتے ہیں وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوں گے، (دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لئے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیشین گوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے گا، مگر وہ ان کے لئے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ جو شریعتِ الٰہی کے مظہر تھے، اور بندوں کو احکام الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے اور اس حیثیت سے آپ ﷺ کا ہر حکم حکمِ الٰہی ہے، لیکن حکم الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک چیز کو اپنے لئے حرام قرار دیا تو عتابِ الٰہی آیا:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ (تحریم:۶۶-۱)

اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالاں کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے، مگر جب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ ﷺ کو منع فرمادیا، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے، ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لئے مخصوص نہ ہو، امت کے لئے حکمِ الٰہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپ ﷺ کے اس ترک سے امت اپنے لئے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کو بغیر اذنِ الٰہی کے بھی حق تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لئے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعتِ الٰہی کا مبلغ اور قانون ربانی کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ:۹-۲۹)

اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے، جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیوں کہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکمِ شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علمِ عقائد اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علم اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضع قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور اسی کے امر ونہی سے بندوں نے فرض وواجب اور حرام وحلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ رہجری اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لا حاكم سوى الله تعالىٰ ولا حكم الا ما حكم به، ويتفرع عليه ان العقل لا يحسن ولا يقبح ولا يوجب شكر المنعم وانه لا حكم قبل ورود الشرع (ج۱ص۱۳ مطبعۃ المعارف مصر ۱۹۱۴ء)

جاننا چاہئے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے، اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ احکامِ شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے، اور اسی کا قانون قانون ہے، اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عقاب کا حکم عائد کیا جا سکے نہیں ہو سکتا، اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبارِ ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے، علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ رہجری تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاكم لاخلاف فى انه رب العلمين

اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگارِ عالم ہے۔

(ج۲ص۸۹ مطبعہ بولاق مصر ۱۳۱۶ رہجری)

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ رہجری کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ استوی واضح کرتے ہیں:

”حسن وقبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے

لے لینا برا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے، اور دوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے، اور جہل برا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہوسکتا ہے، اشاعرہ (اور عام اہل سنت) کے نزدیک حسن وقبح کے یہ دونوں فیصلے صرف شرع پر موقوف نہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کرسکتی ہے، اور اس فیصلہ کے لئے حکمِ الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے" (ج اص ۹۰ بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)۔

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، ہے یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی مصلحت، جو قیاس وتجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے، اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے، مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ ہجری مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

"حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال ونقص اور دنیاوی غرض ومصلحت کے موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جاسکتا ہے، یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا، اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہوسکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم ودانا کا حکم ہے، لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے، کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہوسکتا" (المقالۃ الثانیہ فی الاحکام)

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکمِ قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

''اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے، اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے، اور معتزلہ کے نزدیک واضعِ قانون وحاکم عقل ہے، یہ غلط ہے، کیوں کہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ عقل بعض احکام الٰہی کو جان سکتی ہے، چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو، اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے''۔

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ/ہجری کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے:

''اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکمِ قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو، تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے، اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم اس کے ساتھ حکمِ الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔'' (ارشاد الفحول ص ۶، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ قول فیصل نقل کرتے ہیں، جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لئے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے، تو افعال کا حسن وقبح کے ساتھ اتصاف، امر ونہی سے پہلے ہی عالمِ حقیقت میں ہو چکا تھا، اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر ونہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن وقبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن وقبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا، تو یہ مذکورہ بالا حسن وقبح بندوں کے حق میں تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے، پس احکام بندوں کے حق میں صرف شرعِ الٰہی پر مبنی ہیں'' (اصول الفقہ ص ۱۲ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۲ھ/ہجری)

حضرت مولانا شہیدؒ کا یہ رسالہ اصولِ فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب ہے،(۱)

(۱) ''تہذیب'' منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے، جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں، ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے، اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ "قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے"۔ یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لئے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پا لیتی ہے، تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پیش آئی تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرینِ قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر اور واضعِ شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقتِ خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لئے کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول، اور کلیات، اور دوسرے ہیں، اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، تغیر و تبدل اور تجدد (یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا) یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جو ان ہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر متبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لئے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا، اور اب بندوق سے، تپنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے، اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے، لیکن ذرائعِ قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائکلوں، اسکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آجائیں، یا نقصان پہنچ جائے تو اصولِ کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے

پیشِ نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول وفروع پر پوری نگاہ رکھتے ہوں، آیات واحادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل واسباب اور مصالح ومقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہل اصول کے اس مسئلہ کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزئیہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہا نے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے، اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

اشاریہ و کتابیات

سیرۃ النبی ﷺ

حصہ ہفتم

مرتبہ

کلیم صفات اصلاحی

رفیق دارالمصنفین

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

اشاریہ

اشخاص

(الف)

(حضرت) آدم علیہ السلام : ۹۶،۹۸،۱۰۱،۱۰۲،
۱۰۳،۱۰۴،۱۰۵
آلوسی زادہ (مفتی) : ۱۰۰
آمدی (علامہ) : ۱۳۱
ابراہیم علیہ السلام (پیغمبر): ۲۱،۱۲۴،۱۲۶
ابراہیم علیہ السلام (صاحب زادہ رسول ﷺ): ۵۱
ابن ابی شیبہ : ۶۶
ابن حبان : ۱۱۰
ابن حجر : ۶۴
ابن خطاب : دیکھیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ
ابن خلدون (علامہ) : ۷۳،۷۴
ابن زید : ۱۰۱
ابن سعد : ۳۶،۳۷
ابن عابدین : ۹
ابن عمرؓ : ۶۶
ابن کثیر (حافظ) : ۱۱۰،۱۱۲
ابن نجار : ۶۶
ابن ہشام : ۳۴،۳۶
ابن ہمام (علامہ) : ۱۳۱
ابوالحسن علی ندوی : ۶
ابوبکرؓ (خلیفہ) : ۵۷،۵۹،۶۵،۶۶
ابوجہل : ۳۶
ابوطالب : ۳۶
ابوطلحہ : ۸۱
ابوعبید بن سلام : ۹
ابومسعود انصاریؓ : ۶۹
ابونعیم : ۶۱
ابوہریرہؓ (حضرت) : ۶۶
ابویعلی : ۸،۱۰۹
ابویوسف (قاضی) : ۹
احمد (ابن حنبل) : ۳۴
احمد تھانوی : ۸
اسامہ بن زید : ۵۰
استوی (علامہ) : ۱۳۱
اسماعیل شہید (شاہ) : ۱۳۳،۱۳۴
اسماعیل عجلونی : ۶۶،۱۰۹
اقبال (علامہ) : ۵
ام سلمہ : ۵۷،۵۸

(ب)

باذان (ایرانی حاکم) : ۴۳

بحرالعلوم (مولانا) : ۱۳۳

بخت نصر : ۲۴

براء بن عازبؓ : ۷۹

بریرہ رضی اللہ عنہا (حضرت) : ۵۵، ۵۶

بلاذری : ۸۱

بلالؓ (حضرت) : ۶۴

بودھ (دیوتا) : ۱۱

بیہقی : ۳۴، ۶۱، ۶۶، ۱۰۶

(ح)

حاطب بن بلتعہ : ۷۱، ۷۲

حافظ شیرازی : ۹۱، ۹۲

حاکم : ۳۴، ۶۶، ۸۴، ۸۵

حمیر : ۴۸

(د)

داؤد علیہ السلام (حضرت، پیغمبر) : ۲۱، ۸۴، ۹۸، ۹۹، ۱۱۹

دخین : ۷۳

(ذ)

ذوالخویصرہ (بنو تمیم کا ایک شخص) : ۵۹

(ر)

راغب اصفہانی (امام) : ۹۹، ۱۰۰

(ز)

زبیر : ۵۸، ۵۹

زرقانی : ۶۴

زیاد بن ابی سفیان : ۴۷

زید بن سعنہ : ۶۱

(س)

سبا (ملکہ) : ۴۸

سخاوی : ۱۰۹

سعد بن ابی وقاصؓ : ۸۱

سعد بن عبادہؓ : ۸۰

سلیمانؑ (حضرت، پیغمبر) : ۲۱

سلیمان ندوی (سید) : ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۷

سہیلی (امام) : ۶۴

سیوطی (علامہ) : ۶۱

(ش)

شاطبی (امام) : ۸

شاہ ولی اللہ : ۱۶، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵

شبلی (علامہ) : ۱

شوکانی (قاضی) : ۱۳۳

شہاب خفاجی : ۶۱

(ص)

صباح الدین عبدالرحمٰن (سید) : ۳، ۷

صدیق حسن خان (نواب) : ۱۱۰

(ض)

ضمام بن ثعلبہ : ۷۹

(ط)

طالوت : ۲۱

طبرانی : ۶۱

طبری (محدث) : ۱۴

طفیل دوسی : ۴۵

(ع)

عارف عمری : ۵۰، ۱۱۰

عائذ بن عمرو : ۸۸

عائشہ رضی اللہ عنہا (حضرت) : ۵۵، ۵۶، ۶۱

عبادہ بن صامت : ۱۱

عباسؓ (حضرت) : ۵۰

عبداللہ بن ابی اوفیٰ : ۶۸

عبداللہ بن ابی بن سلول : ۶۵

عبداللہ بن رواحہ : ۸۱

عبداللہ بن عباس : ۱۰۱، ۱۰۹

عبداللہ بن مسعود : ۷۳

عبدالمطلب : ۶۱، ۷۹

عبیداللہ بن زیاد : ۸۸

عتبہ : ۳۵

عدی بن حاتم : ۶۸، ۷۶، ۱۲۸

عروہ بن مسعود : ۸۰، ۸۱

عزالدین بن عبدالسلام : ۱۶

عقبہ بن عامر : ۷۳

علیؓ (حضرت) : ۵۹

عمرؓ (حضرت) (خلیفہ) : ۴۹، ۵۳، ۵۴،
۵۷، ۵۹، ۶۱، ۶۴، ۶۸، ۷۱، ۷۲، ۷۴، ۸۵

عیسیٰ علیہ السلام (حضرت، پیغمبر): ۲۴، ۱۰۷، ۱۱۱

(ف)

فاطمہؓ (حضرت) (جگر گوشۂ رسول ﷺ): ۵۰

فاطمہ بنت قیس : ۶۰

فرعون (شاہِ مصر) : ۲۳، ۱۱۸

(ق)

قارون : ۴۱

قیس بن سعد : ۵۴

قیصر : ۵، ۳۴، ۳۸، ۴۳، ۴۵، ۴۶، ۵۳، ۵۴،
۸۰، ۸۲، ۹۴

(ک)

کسریٰ : ۵، ۳۴، ۳۸، ۴۳، ۴۵، ۴۶، ۵۳، ۵۴،
۸۰، ۸۲، ۹۴

کعب بن اشرف : ۶۸

کعب بن عمرو : ۷۰

(م)

ماعز بن مالکؓ : ۶۹

ماوردی (قاضی) : ۸۹

محب اللہ بہاری : ۱۳۲

محلم (حبشی شخص) : ۷۰

محمد (امام) : ۹

محمد بن سلمہ : ۸۵،۶۸

محمد علی : ۳۵

محمود (بادشاہ) : ۶۶

مریمؑ (والدہ عیسیٰ علیہ السلام) : ۱۲۷

مسولینی (شاہِ اٹلی) : ۱۲۹

مسیح : دیکھئے عیسیٰؑ

معاذ : ۵۴

معاویہؓ (حضرت) : ۸۵،۷۲،۶۷

معقل بن یسار : ۸۸

مغیرہ بن شعبہ : ۸۰

موسیٰؑ (حضرت) : ۱۱۸،۹۹،۲۷،۲۳،۲۱،۱۹

مونارک (شاہِ ہومر) : ۱۱۸

(ن)

نجاشی (شاہِ حبش) : ۸۰،۴۵

نعمان بن منذر : ۴۳

نمرود : ۱۱۸

نوح علیہ السلام (حضرت، پیغمبر): ۱۱۲،۹۸،۹۷

(ہ)

ہارون : ۹۹

ہاشم : ۵۲

ہٹلر : ۱۱۹

ہشام بن حکیم بن حزام : ۷۵

ہود علیہ السلام (حضرت، پیغمبر) : ۹۷

(ی)

یحییٰ بن آدم القرشی (مصنف کتاب الخراج) : ۹

یوسف : ۱۲۵

کتب

قرآن مجید : ۵، ۱۳، ۱۸، ۲۴، ۲۸، ۳۲، ۴۱، ۴۴، ۷۲، ۸۵، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰

(الف)

احکام السلطانیہ (مصنفہ قاضی ابویعلی حنبلی) : ۹

احکام السلطانیہ (مصنفہ قاضی ماوردی) : ۹

ارشاد الفحول : ۱۳۳

اصول الفقہ : ۱۳۳

انجیل : ۳۰، ۸۲

انسائیکلوپیڈیا : ۱۱۸

(ب)

بحرالرائق : ۹

(ت)

تاریخ روما : ۱۱۹

تحریر ابن ہمام : ۱۳۲

ترمذی (الجامع الصحیح) : ۶۱، ۶۴، ۶۵، ۸۴، ۸۵، ۹۰، ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۸

تفسیر ابن جریر : ۱۰۷

تفسیر ابن کثیر : ۱۲۸

تفسیر بغوی : ۱۰۷

تفسیر بیضاوی : ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۳۱

تفسیر خازن : ۱۰۷

تفسیر طبری : ۱۴

تفسیر کشاف : ۱۰۰

توراۃ : ۳۰، ۹۵

توضیح وتلویح : ۸

(ح)

حجۃ اللہ البالغہ : ۱۶، ۱۱۴

(خ)

خطبات مدراس : ۲، ۵

(ر)

رسول وحدت : ۵

روح المعانی (تفسیر) : ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۷

روض الانف : ۶۴

(ز)

زرقانی علی المواہب : ۶۴

(س)

سنن ابن ماجہ : ۵۱، ۵۴، ۶۰، ۱۰۶، ۱۰۹

سنن ابوداؤد : ۴۵، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۴، ۵۵، ۵۹، ۶۰، ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۸۱، ۱۰۹

سنن نسائی : ۲، ۱۰۶، ۱۰۹

سیرت ابن ہشام : ۳۴، ۳۶، ۵۶، ۶۴

سیرۃ النبی ﷺ (حصہ سوم) : ۲، ۶، ۳۸
سیرۃ النبی ﷺ (حصہ چہارم) : ۲
سیرۃ النبی ﷺ (حصہ پنجم) : ۲
سیرۃ النبی ﷺ (حصہ ششم) : ۲
سیرۃ النبی ﷺ (حصہ ہفتم) : ۳، ۷

(ش)

شرحِ شفا : ۶۱

(ص)

صحیح بخاری : ۴۶، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۴، ۵۶، ۵۷
۵۸، ۵۹، ۶۵، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۲، ۷۶، ۷۸، ۸۰
۸۲، ۸۳، ۸۸، ۹۱، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۲، ۱۱۴
صحیح مسلم: ۳۴، ۴۶، ۵۱، ۵۴، ۵۶، ۶۰، ۶۸، ۶۹
۷۵، ۷۶، ۸۰، ۸۳، ۸۸، ۹۰، ۱۰۴، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۴

(ط)

طبقات ابن سعد : ۳۶، ۳۷، ۶۴

(ف)

فتح الباری : ۶۴
فتح البیان : ۱۱۰
فتوح البلدان : ۸۱

(ک)

کتاب الاحکام فی اصول الاحکام : ۱۳۱
کتاب الاموال : ۹
کتاب الخراج : ۹، ۲۳
کتاب السیر : ۹
کتاب المراسیل : ۶۴
کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام : ۱۶
کشاف اصطلاحات الفنون : ۸
کشف الخفاء : ۱۰۹
کنز العمال : ۱۰۶، ۱۰۹

(م)

مستدرک حاکم : ۸۴، ۸۵، ۸۷، ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۲
مسلم الثبوت : ۱۳۳
مسند ابی داوٗد طیالسی : ۱۰۹
مسند احمد : ۵۱، ۶۱، ۸۵، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۲۸
مسند احمد بن الشریح : ۵۱
مصنف عبدالرزاق : ۶۴
معارف (رسالہ) : ۹۶
مفردات : ۹۹
مقاصد حسنہ : ۱۰۹
مقدمہ ابن خلدون : ۷۴
منوشاستر : ۱۱
منہاج الاصول : ۱۳۱
موافقات (تصنیف شاطبی) : ۸۹
موطا : ۱۰۶

(ن)

نووی شرح مسلم : ۶۴

مقامات

(الف)

اٹلی : ۱۱۹

احد (پہاڑ) : ۶۵

احزاب : ۸۱

اعظم گڈھ : ۷

ام القریٰ : دیکھئے مکہ

امریکہ : ۱۲۰

انگلستان : ۱۲۰،۱۱۹

ایران : ۵۴،۵۳،۴۸،۴۷،۴۳،۳۶
۹۴،۷۹،۶۲

(ب)

بابل : ۲۴

بحرین : ۴۸،۴۳

بدر : ۸۰،۷۲،۶۵،۶۴،۵۶،۳۱

برک الغماد (یمن کا ایک مقام) : ۸۰

بسوس (جنگ) : ۴۸

بنگال : ۱۶

بصرہ : ۸۸

بولاق : ۱۳۱

بہار (صوبہ) : ۱۶

بیت المقدس : ۳۸،۲۶،۲۴

(پ)

پنجاب : ۱۶

(ت)

تبوک : ۴۵

تہامہ : ۴۴

(ج)

جاپان : ۱۱۸

جرمنی : ۱۱۹

(چ)

چین : ۱۱۸

(ح)

حبش : ۴۸،۴۵،۳۸

حجاز : ۴۸،۴۴،۳۶

حدیبیہ : ۳۲، ۴۵، ۵۷، ۵۸، ۷۹

حنین : ۶۵، ۷۰

حیدرآباد : ۸۵، ۱۰۶، ۱۱۹

حیرہ : ۳۶، ۴۳، ۵۴

(خ)

خانۂ کعبہ : ۷۸

خیبر : ۳۲، ۸۱

(د)

دارالترجمہ : ۱۱۹

دارالعلوم ندوۃ العلماء : ۶

دارالکتب : ۳۴

دارالمصنفین (ادارہ) : ۳، ۷

دائرۃ المعارف (ریسرچ سینٹر) : ۱۰۶

دکن : ۱۱۹

دہلی : ۱۳۳

(ر)

روم : ۳۶، ۳۸، ۴۳، ۴۵، ۴۷، ۵۳،
۵۴، ۷۹، ۹۴

روما، رومہ: دیکھئے روم

(ش)

شام : ۴۳، ۴۵، ۶۱، ۷۵

(ط)

طور (پہاڑ) : ۹۹

(ع)

عراق : ۴۳، ۱۱۸

عقبہ : ۳۶

عمان : ۴۳

(غ)

غسان : ۳۶

(ف)

فارس : دیکھئے ایران

فرانس : ۱۲۰

(ق)

قسطنطنیہ : ۳۸، ۴۳

(ک)

کلکتہ : ۸

کندہ : ۴۸

کوفہ : ۸۵

(ل)

لائیڈن : ۳۶، ۳۷

لکھنؤ : ۶، ۱۰۱

(م)

مدائن : ۳۸

مدینہ : ۳۷، ۳۸، ۴۴، ۴۵، ۵۶، ۶۳، ۶۵، ۷۶، ۷۸، ۸۵

مصر : ۱۴، ۲۳، ۳۴، ۳۸، ۸۳، ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۱۸، ۱۲۵، ۱۳۱، ۱۳۳

مکتبہ قدسی (ادارہ) : ۶۶

مکہ : ۳۱، ۳۵، ۳۶، ۴۳، ۴۵، ۷۱

موتہ : ۴۳

(ن)

نجد : ۴۴، ۴۸، ۷۸

نجران (قبیلہ) : ۲۲، ۲۳

(ہ)

ہجر : ۴۴

ہندوستان : ۳۸

ہوازن (قبیلہ) : ۶۵

ہومر : ۱۱۸

(ی)

یمن : ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۸، ۸۰

یوپی : ۱۶

یورپ : ۶۷، ۸۱، ۸۲، ۱۲۰

یونان : ۶۲، ۱۱۸، ۱۱۹